www.cpsglobal.org
www.mwkhan.com

الرسالہ

Al-Risala

November-December 2023 • Rs. 40

بامقصد آدمی کی پہچان یہ ہے کہ صبح کو وہ اپنا
منصوبہ بنائے، اور شام کو وہ اپنا محاسبہ کرے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Nov-Dec 2023 | Volume 48 | Issue 6

Prof. Farida Khanam
Editor-in-Chief

Dr Stuti Malhotra
Editor (Hindi Section)

Farhad Ahmad
Assistant Editor

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market
New Delhi 110013
Mobile: 8588822679, Tel. 0120 4314871
Email: cs.alrisala@gmail.com

Annual Subscription Rates

Retail Price	₹40 per copy
Subscription by Book Post	₹200 per year
Subscription by Regd. Post	₹400 per year
Subscription (Abroad)	US $20 per year

Bank Details
Saniyasnain Khan
State Bank of India
A/c No: 30087163574
IFSC Code: SBIN0009109

UPI
UNIFIED PAYMENTS INTERFACE

To order books by
Maulana Wahiduddin Khan
please contact Goodword Books
Tel. 0120 4314871, Mobile: 8588822675
Email: sales@goodwordbooks.com

تحریر

مولانا وحید الدّین خاں

فہرست

یکم جنوری	4
کائناتی عبادت	5
مطالعۂ حدیث شرح مشکاۃ المصابیح	6
اجتہاد کا معاملہ	12
جدید مسئلہ کیا ہے؟	13
ڈائلاگ اسلام میں	22
ڈائری 1986	27
ماڈرن ایج میں سیرت نبوی کا ریلیونس	43
خبر نامہ اسلامی مرکز–281	49

सारा ख़ून	1
आदमी की परख	2
मानवीय गुण	3
इच्छा-सूची	5
इन्साफ़ का तरीक़ा	7
अल्लाह के डर की वजह से कोड़ा हाथ से गिर पड़ा	10
ये विशेषज्ञ	10
उदार हृदयता	11
अल्लाह से मांगने की सबसे बड़ी चीज़ मग़फ़िरत है	14
तरतीब	15
जो खोए वही पाता है	15

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of Al-Markazul Islami, New Delhi
Printed at Tara Art Printers Pvt. Ltd. A46-47, Sector 5, Noida-201301
Published from 1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013 Editor: Saniyasnain Khan

یکم جنوری

عیسوی کیلنڈر کے مطابق یکم جنوری کو نئے سال کا آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ پوری دنیا میں یکم جنوری کو سالِ نو (New Year's Day) کا جشن منایا جاتا ہے۔ نئے سال کو اس امید کے ساتھ منایا جاتا ہے کہ آنے والا سال بہتر طور پر گزرے گا۔ مگر یہ مقصد اسی شخص کو حاصل ہوسکتا ہے، جو اپنا محاسبہ کرتا رہے، نہ کہ ایسے شخص کو جو غفلت کی زندگی گزارے۔

قانونِ فطرت کے مطابق، ہر نیا دن اگلے دن ایک گزرا ہوا دن بن جاتا ہے، اور انسان کی عمر میں سے ایک دن کم ہوجاتا ہے۔ مثلاً یکم جنوری 1997 کے دن 31 دسمبر 1996 پرانا دن تھا۔ ایک دن کے بعد یکم جنوری 1997 بھی لازمی طور پر تاریخ کا حصہ بن جائے گا۔ اس دنیا میں ہر چیز نئی سے پرانی ہوتی رہتی ہے۔ ہر حال آخر کار ماضی میں تبدیل ہوجاتا ہے، جس کو واپس لانا ممکن نہیں، لیکن اس کے تجربات سے فائدہ اٹھانا یقینی طور پر ممکن ہے۔ یہ فطرت کا ایک اٹل اصول ہے۔

یہ موجودہ دنیا کا قانون ہے۔ اس سلسلہ میں ہر عورت اور مرد کا پہلا فرض ہے کہ وہ اپنا محاسبہ (introspection) کرے۔ کامیاب انسان وہ ہے، جو بے لاگ انداز میں بار بار اپنا جائزہ لیتا رہے۔ یعنی یہ دیکھنا کہ پچھلے سال ہم نے کیا کھویا، اور کیا پایا۔ تاکہ وہ نئے سال کے لیے زیادہ بہتر منصوبہ بندی کر سکے۔ یہ کام ہر آدمی کو خود کرنا پڑتا ہے۔ کوئی دوسرا انسان آپ کو صرف مشورہ دے سکتا ہے، وہ آپ کے ذاتی محاسبہ کا عمل انجام نہیں دے سکتا۔

ڈائری اس معاملہ میں مددگار عنصر (supporting element) کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو شخص پورے سال اپنی ڈائری لکھے، وہ اپنی ذات کے لیے پوری طرح محاسبہ کا فائدہ حاصل کرسکتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ مولانا وحید الدین خاں صاحب عام طور پر اپنے ملاقاتیوں کو ڈائری لکھنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ اس کا ریزن وہ یہ بتاتے تھے کہ اس سے آپ کو اپنا انٹلکچول ڈیولپمنٹ کرنے میں مدد ملے گی۔ ڈائری حقیقۃً ایک شخص کی تجرباتی زندگی کا ریکارڈ ہے۔ اگر انسان ڈائری لکھنے کا سلسلہ شروع کرے تو یہ ڈائری ماضی کے تجربات کی روشنی میں اس کے حال میں ذہنی ارتقا کے لیے گائڈ بک ثابت ہوگی۔ (ڈاکٹر فریدہ خانم)

کائناتی عبادت

ایک حدیثِ رسول ان الفاظ میں آئی ہے: عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَسِيرُ الْفِقْهِ خَيْرٌ مِنْ كَثِيرِ الْعِبَادَةِ وَخَيْرُ أَعْمَالِكُمْ أَيْسَرُهَا (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 286)۔ یعنی عبد الرحمٰن بن عوف روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: دین کی تھوڑی فقہ بہتر ہے، زیادہ عبادت سے۔ اور تمھارے اعمال میں سے وہ بہتر ہے، جو آسان تر ہو۔

اس حدیث میں فقہ سے مراد تدبر و تفکر (contemplation) ہے، اور عبادت سے مراد مبنی بر فارم عبادت ہے۔ قرآن کی بیشتر آیتوں میں اس بات پر ابھارا گیا ہے کہ خدا کی کتاب میں تدبر کرو (38:29)، زمین و آسمان میں تدبر کرو، کائنات میں پھیلی ہوئی آیتوں (signs) میں تدبر کرو (3:190)۔ تدبر کیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ خدا کی کتاب میں اور خدا کی تخلیق میں حکمت کے پہلو چھپے ہوئے ہیں، غور کر کے حکمت کے ان پہلوؤں کو دریافت کرنا، اور اس کے مطابق اپنی شخصیت کی تعمیر کرنا۔ یہ تدبر کی تعلیم کا خلاصہ ہے۔ تدبر اور تفکر کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اس کے بغیر آدمی، حیوان کی مانند بن جاتا ہے۔ انسان وہی ہے جس کے اندر تدبر کی صفت موجود ہو۔

جو لوگ تدبر و تفکر کی صفت سے خالی ہوں، ان کے بارے میں قرآن میں سخت تنبیہ آئی ہے: ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ وہ ایسے ہیں جیسے چوپائے، بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ۔ یہی لوگ ہیں غافل (7:179)۔

معلوم کائنات میں صرف انسان ہے جو یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ تدبر کرے۔ یہ تدبر پہلے روایتی فریم ورک میں کیا جا سکتا تھا۔ اب تدبر کا یہ عمل سائنسی فریم ورک میں کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ اس طرح انسان اللہ کی بے پایاں عظمت کو دریافت کرتا ہے۔ وہ اللہ سے حبِّ شدید اور خوفِ شدید کا تعلق قائم کرتا ہے۔ وہ آخرت کی ابدی جنت کو اپنے تصور میں لاتا ہے۔ یہی تدبر ہے، اور اسی تدبر کو کائناتی عبادت کہا گیا ہے۔

مطالعۂ حدیث

شرح مشکاۃ المصابیح

(حدیث نمبر 95-86)

86

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالی نے ہر آدمی پر اس کے حصہ کا زنا لکھ دیا ہے جس کو وہ ضرور پائے گا۔ آنکھ کا زنا دیکھنا ہے اور زبان کا زنا گفتگو ہے۔ دل تمنا اور خواہش کرتا ہے، شرمگاہ اس خواہش کو سچا یا جھوٹا کرتی ہے۔ (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 6343، صحیح مسلم، حدیث نمبر 20)

مرد اور عورت کے درمیان ایک دوسرے کے لیے شدید کشش رکھی گئی ہے۔ اس لیے فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ایک کے دل میں دوسرے کی نسبت سے غلط خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ مگر ایسے کسی خیال پر اس وقت تک پکڑ نہیں جب تک کہ اقدام کرکے اس کو عملی واقعہ نہ بنا دیا جائے۔

87

عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ قبیلۂ مزینہ کے دو آدمیوں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اے خدا کے رسول، آپ کا کیا خیال ہے، لوگ آج جو عمل کر رہے ہیں اور جو کچھ وہ کوشش کر رہے ہیں، کیا یہ ایسی چیز ہے جس کا ان کے بارے میں (پہلے) فیصلہ ہو چکا ہے، یعنی جو ان میں جاری ہو چکا ہے، وہ پہلے ہی سے مقدر ہے۔ یا وہ ان چیزوں میں سے ہے جو مستقبل میں طے ہوتا ہے اس بنیاد پر جیسا کہ ان کے نبی ان کے پاس (تعلیم) لائے، اور حجت قائم ہو گئی۔ آپ نے فرمایا، نہیں، بلکہ ایسی چیز ہے جو ان کے بارے میں قرار پا چکی ہے اور وہ ان میں جاری ہے، اُس اعتبار سے جیسا کہ اللہ کی کتاب (91:7-8) تصدیق کرتی ہے: اور جان کی قسم جیسا کہ اس کو ٹھیک کیا۔ پھر اس کو سمجھ دی، اس کی بدی کی اور اس کی نیکی کی۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 10)

قرآن کی مذکورہ آیت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کا مطلب یہ ہے کہ

انسان کو اللہ تعالی نے صحیح فطرت پر پیدا کیا ہے اور نیکی اور بدی کا شعور پیدائشی طور پر اس کے اندر رکھ دیا ہے۔ اس کو عقل وشعور کی صلاحیت عطا کی ہے، جس کے ذریعہ وہ برائی اور بھلائی کے درمیان تمیز کرسکتا ہے۔ اس کو یہ سمجھ عطا کی ہے کہ دنیا میں کیا چیز اس کے لیے بری ہے، اور کیا چیز اچھی۔ یہی وہ چیز ہے جس کی بنیاد پر انسان کی پکڑ ہوگی۔

88

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میں ایک جوان آدمی ہوں اور میں اپنے آپ پر گناہ سے ڈرتا ہوں۔ اور میں یہ وسعت نہیں پاتا کہ میں عورتوں سے نکاح کروں۔ گویا کہ وہ آپ سے خصی (castrate) ہونے کی اجازت چاہتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے سوال پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ میں نے دوبارہ اسی طرح پوچھا۔ مگر آپ خاموش رہے۔ میں نے پھر وہی دہرایا۔ مگر آپ خاموش رہے۔ میں نے چوتھی بار وہی بات دہرائی تو رسول اللہ نے فرمایا کہ اے ابو ہریرہ، قلم خشک ہو چکا، جو تمہارے ساتھ ہونے والا ہے، چاہے تم خصی بن جاؤ یا تم رہنے دو (صحیح البخاری، حدیث نمبر 5076)۔

بار بار سوال کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاموشی غالباً اس لیے تھی کہ اسلام میں یہ پسندیدہ نہیں کہ آدمی ہر مسئلہ کو شرعی مسئلہ بنا کر اس کے بارے میں سوال کرے۔ اسلام کے مطابق آدمی کے لیے زیادہ درست بات یہ ہے کہ وہ شریعت کے واضح احکام کو سامنے رکھے اور پھر اپنے ضمیر کی روشنی میں معاملے کا فیصلہ کرے۔

89

عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمام انسانوں کے دل اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہے، ایک دل کی مانند۔ وہ جس طرح چاہتا ہے اس کو پھیرتا رہتا ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا — اے اللہ، دلوں کو پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنی فرماں برداری کی طرف پھیر دے۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2654)

اس حدیث کا مطلب مذکورہ دعا (اللَّهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوبِ صَرِّفْ قُلُوبَنَا عَلَى طَاعَتِكَ) کے ذریعہ واضح ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی اپنا تزکیۂ نفس کرنا چاہے اس کو اپنی

کوشش کے ساتھ خدا سے مدد مانگنا چاہیے۔ کیوں کہ انسان خدا کی مدد کے بغیر تنہا اپنے تزکیہ کا عمل ہرگز انجام نہیں دے سکتا ہے۔

90

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر پیدا ہونے والا فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی بنا دیتے ہیں یا نصرانی بنا دیتے ہیں یا مجوسی بنا دیتے ہیں جیسا کہ جانور بے عیب بچہ جنتا ہے۔ کیا تم اس میں کوئی جسمانی خرابی پاتے ہو۔ پھر ابوہریرہ نے قرآن سے سورہ الروم کی آیت 30 پڑھی: یہ اللہ کی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 1358، صحیح مسلم، حدیث نمبر 22)۔

تمام انسانوں کی فطرت (نیچر) ایک ہے۔ ہر آدمی اسی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد جب وہ ماحول کے اندر نشوونما پاتا ہے تو اس کی فطرت پر ماحول کا اثر غالب آجاتا ہے۔ اگر آدمی اپنی ابتدائی فطرت کو زندہ رکھے تو کوئی برائی آدمی کو خدا کے مطلوب راستہ سے دور نہیں کرسکتی۔

اس حدیثِ رسول میں والدین سے مراد قریبی ماحول ہے۔ ہر انسان پیدائشی طور پر مسٹر نیچر ہے، لیکن ماحول کے اثر سے وہ مسٹر کنڈیشنڈ (Mr. Conditioned) بن جاتا ہے۔ یہ کنڈیشننگ بلاشبہ ہر انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اِس بنا پر ہر انسان درست سوچ (right thinking) سے محروم رہتا ہے۔ وہ کنڈیشنڈ شخصیت کے ساتھ جیتا ہے اور کنڈیشنڈ شخصیت کے ساتھ ہی مرجاتا ہے۔ اپنی عدم واقفیت کی بنا پر اس کو کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ وہ اپنے کنڈیشنڈ مائنڈ کی ڈی کنڈیشننگ کرے۔

انسان سے مطلوب ہے کہ وہ اپنے شعوری فیصلے کے تحت، اپنی ڈی کنڈیشننگ کرے۔ وہ اپنے آپ کو دوبارہ انسانِ فطری (Mr. Nature) بنائے۔ جو آدمی ایسا نہ کرسکے، وہ سچائی کو دریافت کرنے میں ناکام ہوجائے گا۔ خواہ رسول کے زمانے کا انسان ہو یا رسول کے بعد کے زمانے کا انسان۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر آدمی اپنا بے لاگ محاسبہ (introspection) کرکے اپنی کنڈیشننگ کو دریافت کرے۔ اور سیلف ہیمرنگ کے ذریعے اپنے آپ کو اس کنڈیشننگ سے آزاد کرے۔

یہاں تک کہ وہ دھیرے دھیرے مکمل معنوں میں ایک ڈی کنڈیشنڈ انسان بن جائے۔ ڈی کنڈیشننگ کے عمل کو غالباً قرآن میں تزکیہ کہا گیا ہے۔

91

ابوموسی الاشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور آپ نے ہم کو پانچ باتیں بتائیں — اللہ کبھی نہیں سوتا اور نہ اس کی یہ شان ہے کہ وہ سوئے۔ وہ ترازو کو جھکاتا ہے اور وہی اس کو اٹھاتا ہے۔ اس کے یہاں تمام اعمال پیش کیے جاتے ہیں، رات کا عمل دن کے عمل سے پہلے اور دن کا عمل رات کے عمل سے پہلے۔ اس کا پردہ نور ہے۔ اگر وہ اپنا پردہ اٹھا دے تو اس کی ذات کی شعائیں حد نظر تک مخلوق کو جلا دیں۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 179)

اس حدیث میں دو حقیقتیں بتائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ خدا لامحدود (limitless) طاقتوں کا مالک ہے۔ اور دوسرے یہ کہ خدا ہر لمحہ انسان کے قول و عمل سے باخبر رہتا ہے۔ یہ دونوں باتیں اگر انسان کے ذہن میں تازہ رہیں تو وہ اس کی ہدایت کے لیے کافی ہو جائیں۔

92

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کا ہاتھ بھرا ہوا ہے، اس کو رات اور دن کی بخشش بھی کم نہیں کرتی ہے، پھر آپ نے فرمایا کہ تم لوگوں نے غور کیا، جب سے آسمانوں اور زمین کو اللہ نے پیدا کیا ہے کس قدر خرچ کر رہا ہے، مگر جو کچھ اس کے ہاتھ میں ہے، اس میں کمی نہیں ہوئی، پھر فرمایا کہ اس کا عرش پانی پر تھا اور اس کے ہاتھ میں ترازو ہے کہ وہ اس کو جھکاتا ہے اور وہ اس کو اٹھاتا ہے (متفق علیہ)۔ امام مسلم کی روایت میں ہے کہ اللہ کا دایاں ہاتھ بھرا ہوا ہے۔ اور ابن نمیر (راوی) نے کہا کہ بھرا ہوا ہے، وہ خرچ کرتا اور دیتا ہے، دن میں بھی اور رات میں بھی، اور اس میں کوئی کمی نہیں ہوتی (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 4684؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 37)۔

اس حدیث میں خدا کی اتھاہ قدرت و ملکیت کو بیان کیا گیا ہے۔ ایمان کا آغاز خدا کی معرفت سے ہوتا ہے۔ یعنی تخلیقات میں غور و فکر کر کے خدا کو خالق و مالک کی حیثیت سے دریافت کرنا۔ جدید سائنسی انکشافات نے اس غور و فکر کا دائرہ لامحدود حد تک وسیع کر دیا ہے۔ انسان جب تدبر و تفکر کے ذریعہ اعلیٰ معرفتِ خداوندی کا ادراک کرتا ہے تو وہ پاتا ہے کہ انسان عاجز مطلق (all-powerless) ہے

اور خدا قادرِ مطلق (all-powerful) ۔ خدا کی قدرت کی یہ لامحدودیت تقاضا کرتی ہے کہ انسان بلاشرط اس پر یقین کرے، کسی بھی حال میں اس کا اعتماد متزلزل نہ ہو۔

93

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین کی اولاد کے بارے میں سوال کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ زیادہ جانتا ہے کہ وہ کیا عمل کرتے ہیں (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 1384، صحیح مسلم، حدیث نمبر 26)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ سوال کا واضح اور قطعی جواب نہیں دیا۔ اس میں غالباً اشارہ ہے کہ اس طرح کے سوالات کا تعلق خدا سے ہے، نہ کہ انسان سے۔ اس لیے بہتر ہے کہ اس بارے میں توقف کیا جائے۔ اور حتمی انداز میں ان کو جنتی یا جہنمی نہ بتایا جائے۔

94

عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے سب سے پہلے جو چیز پیدا کی وہ قلم ہے۔ اس نے قلم سے کہا کہ لکھ۔ قلم نے کہا کہ میں کیا لکھوں۔ اللہ نے فرمایا کہ تقدیر کو لکھ، یعنی ہر وہ چیز جو واقع ہو چکی ہے اور جو (مستقبل میں) واقع ہونے والی ہے (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2155)۔

اس حدیث میں تمثیل کی زبان میں یہ بتایا گیا ہے کہ خدا نے کائنات کو پیدا کرتے ہی اس کا ایک ابدی قانون مقرر کر دیا۔ اب کائنات اور انسانی تاریخ ابد تک اسی قانون پر چلے گی، اس میں کوئی تبدیلی ہونے والی نہیں۔

95

مسلم بن یسار تابعی کہتے ہیں کہ عمر بن الخطاب سے قرآن کی آیت (وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ ۔۔۔) کے بارے میں پوچھا گیا۔ عمر نے جواب دیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے بارے میں سوال کرتے ہوئے سنا۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ نے آدم کو پیدا کیا۔ پھر ان کی پشت پر اپنا داہنا ہاتھ پھیرا۔ پھر ان کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا۔ پھر اللہ نے فرمایا کہ میں نے اِن لوگوں کو جنت کے لیے پیدا کیا ہے۔ اور وہ اہل جنت والا عمل کریں گے۔ اللہ نے پھر

اپنا ہاتھ آدم کی پیٹھ پر پھیرا۔ اور کہا کہ میں نے ان کو جہنم کے لیے پیدا کیا ہے۔ اور وہ اہل دوزخ والا عمل کریں گے۔ ایک آدمی نے کہا کہ اے خدا کے رسول پھر کس چیز میں عمل۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ کسی بندہ کو جنت کے لیے پیدا کرتا ہے تو اس کو اہل جنت والے عمل میں لگا دیتا ہے، یہاں تک کہ اس کی وفات اہلِ جنت کے اعمال میں سے کسی عمل پر ہوتی ہے پھر اس عمل کی بنیاد پر اس کو جنت میں داخل کر دیتا ہے۔ اور جب اللہ کسی بندے کو دوزخ کے لیے پیدا کر دیتا ہے تو اس کو اہلِ دوزخ والے عمل میں لگا دیتا ہے، یہاں تک کہ اس کی وفات اہلِ دوزخ کے اعمال میں سے کسی عمل پر ہوتی ہے پھر اس عمل کی بنیاد پر اس کو دوزخ میں داخل کر دیتا ہے (موطا امام مالک، حدیث نمبر 2، سنن الترمذی، حدیث نمبر 3075؛ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 4703)۔

مکمل آیت کا ترجمہ یہ ہے: اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھ سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر۔ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ انھوں نے کہا ہاں، ہم اقرار کرتے ہیں۔ یہ اس لیے ہوا کہ کہیں تم قیامت کے دن کہنے لگو کہ ہم کو تو اس کی خبر نہ تھی (7:172)۔

اس حدیث میں دراصل مشیتِ الٰہی (تقدیر) کی زبان میں قانونِ الٰہی کا ذکر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو انسان خدا کے مقرر کیے ہوئے راستے کی پیروی کرے گا وہ آخر کار جنت میں پہنچے گا اور جو شخص ان خدائی راستے سے انحراف کرے گا وہ جہنم کا مستحق قرار پائے گا۔ کوئی بھی چیز اس کو جہنم سے بچانے والی نہ ہوگی۔ اصل یہ ہے کہ انسان کو اس کے خالق نے آزاد مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔ انسان کو اس دنیا میں اپنی آزادی کو استعمال کرنے کا کامل اختیار اصل ہے۔ وہ جس طرح چاہے سوچے، وہ جیسا چاہے عمل کرے۔ خالق نے انسان کو پیغمبر کے ذریعے جو دین بھیجا، اس کی حیثیت رہنما (گائڈ) کی ہے۔ لیکن فیصلہ پھر بھی انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ اس گائڈ کا کام انسان کو صرف یہ بتانا ہے کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔ یہ رہنما انسان پر کسی قسم کا کوئی جبر قائم نہیں کرتا۔ انسان کی زندگی کا یہی وہ پہلو ہے جس کی بنا پر اس کو خلیفہ کہا گیا ہے (البقرۃ، 2:30)۔ خلیفہ کا لفظی مطلب ہے بعد کو آنے والا (successor)۔ لیکن مفہوم کے اعتبار سے اس کا مطلب ہے اپنے اختیارات کو آزادانہ طور پر استعمال کرنے والی مخلوق۔ اسی آزادی کے صحیح یا غلط استعمال پر انسان کے ابدی مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے۔

اجتہاد کا معاملہ

اجتہاد کا لفظی مطلب ہے، پوری کوشش کرنا (to strive)۔ قرآن میں اس کے ہم معنی لفظ استنباط آیا ہے (4:83)۔ اجتہاد کا مقصد ہے، بدلے ہوئے حالات میں، دین کے ابتدائی ریفرنس میں دیے گئے حکم کی نئی تطبیق (new application) تلاش کرنا۔ مثلاً جدید طرز کے موزے (socks) کے وجود میں آنے کے بعد اس پر قدیم طرز کے جراب کے حکم کو منطبق کرنا۔

اجتہاد صحیح بھی ہوسکتا ہے اور غلط بھی، لیکن اس اندیشہ کی بنا پر کبھی اجتہاد کے عمل کو روکا نہیں جائے گا۔ صرف یہ زور دیا جائے گا کہ اجتہاد کے لیے اخلاص نیت لازم ہے۔ حدیث میں ہے کہ اگر کوئی مومن اجتہاد کرلے اور اس کا اجتہاد درست ہو تو اس پر اس کو دہرا ثواب ملے گا۔ اور اگر وہ اخلاص نیت کے باوجود اجتہاد میں غلطی کر جائے تو اس کو اس کے اجتہاد پر ایک ثواب ملے گا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7352)۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد کے معاملہ میں ہمیشہ غلطی کا امکان رہتا ہے حتی کہ بڑے بڑے اہل ایمان نے بھی غلطیاں کی ہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ جب اس پر اجتہاد کی غلطی واضح ہوجائے تو وہ کھلے طور پر اپنی غلطی کا اعتراف کرے اور وہ اپنی رائے کو درست کرلے۔

اجتہاد کسی قوم کے لیے زندگی کی علامت ہے۔ اجتہاد سے قوم کے اندر تعمیری عمل مسلسل طور پر جاری رہتا ہے۔ اجتہاد سے لوگوں کے اندر تخلیقی سوچ (creative thinking) پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، جب اجتہاد کا عمل رک جائے تو یقینی طور پر لوگوں کے اندر ذہنی جمود پیدا ہوجائے گا اور ذہنی جمود (intellectual stagnation) بلا شبہ اسلام میں ایک غیر مطلوب چیز ہے۔ جب کوئی آدمی اخلاص نیت کے ساتھ اجتہاد کرے تو فطری طور پر ایسا ہوگا کہ وہ معاملہ پر گہرائی کے ساتھ غور کرے گا، وہ سنجیدگی کے ساتھ اس کا جائزہ لے گا۔ وہ اس موضوع پر کتابوں کا مطالعہ کرے گا۔ وہ اہلِ علم سے اس موضوع پر تبادلۂ خیال کرے گا۔ یہ تمام چیزیں اخلاص نیت میں شامل ہیں۔ ان چیزوں کا ہونا اخلاص نیت کا ثبوت ہے اور ان چیزوں کا نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی کے اندر اخلاص نیت موجود نہیں۔

جدید مسئلہ کیا ہے؟

انسانی تاریخ کو دو بڑے دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ دور سائنس سے پہلے، اور دور سائنس کے بعد۔ وہ چیز جس کو "دور جدید" کہتے ہیں، وہ حقیقۃً دور سائنس کا دوسرا نام ہے۔ یہ دور واضح طور پر سترھویں صدی میں شروع ہوا اور دوسری جنگ عظیم (45-1939ء) تک اپنے آخری عروج پر پہنچ گیا۔

انسان خارجی طور پر جو عمل کرتا ہے، اس کے لیے اس کے پاس دو قدرتی ذریعے ہیں: حواس (senses) اور طاقت۔ حواس کے ذریعے وہ اشیاء کا علم حاصل کرتا ہے، اور طاقت کے ذریعے اپنے ارادہ کو ان کے اوپر نافذ کر کے ان کو اپنے لیے کارآمد بناتا ہے۔ یہ دونوں عمل قدیم ترین زمانے سے جاری ہیں۔ پچھلے زمانہ میں اشیاء کو جاننے کے لیے اس کے پاس صرف وہ قدرتی عطیات تھے جن کو حواس خمسہ (five senses) کہا جاتا ہے اور خارجی دنیا میں تصرف کرنے کے لیے اس کے پاس اپنے ہاتھ پاؤں تھے یا حیوانی طاقت، مثلاً اونٹ، گھوڑے، ہاتھی، بیل وغیرہ۔ تاہم ان ابتدائی قدرتی عطیات کے علاوہ زمین میں بے شمار ایسی چیزیں تھیں جو اس بات کو ممکن بناتی تھیں کہ ان کو حاصل کر کے آدمی اپنے حواس اور طاقت دونوں کی مقدار کو بڑھا سکے۔

اضافے کا یہ عمل نامعلوم زمانے سے جاری تھا۔ مردہ تہذیبوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے ادوار میں بھی انسان اس میدان میں بڑی بڑی ترقیات حاصل کرتا رہا ہے۔ تاہم ماضی کی تمام ترقیاں ابتدائی فطری حدود کے اندر ہوتی تھیں۔ مثلاً پتھر کی جگہ لوہے کو کام میں لانا یا پہیہ دار گاڑی بنا کر جانوروں کو سواری کے لیے استعمال کرنا۔ موجودہ دور کو یہ اولیت حاصل ہے کہ اس نے معلوم تاریخ میں پہلی بار فطرت میں چھپی ہوئی انرجی کو استعمال کر کے ایسے میکانکی اور آلاتی معاون دریافت کر لیے جو ہمارے دیکھنے اور تجربہ کرنے کی صلاحیت کو لاکھوں کروروں گنا زیادہ بڑھا سکتے تھے۔

اس دریافت کا براہ راست فائدہ تو صرف یہ تھا کہ انسانی تمدن کے لیے مادی ترقی کا ایک نیا وسیع تر دروازہ کھل گیا۔ انسان کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ اپنے سفر کی رفتار کو بے حساب مقدار میں بڑھا

سکے۔ زمین کے جن وسائل تک روایتی ذرائع سے اس کی دسترس نہیں ہوسکتی تھی، ان کو حاصل کر کے اپنی بستیوں کو ناقابل قیاس حد تک سنوارے۔ تخریب وتعمیر (destruction and construction) کے لیے، مقدار اور نوعیت (quantity and quality) دونوں اعتبار سے، اتنے زیادہ سامان فراہم کرلے جس کا خواب بھی پچھلے انسانوں نے نہیں دیکھا تھا۔

تاہم انسانی تاریخ کا اتنا بڑا واقعہ بالواسطہ اثرات پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے دھیرے دھیرے انسانی افکار پر بھی اپنے اثرات ڈالنے شروع کیے یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آخر تک یہ عالم ہوگیا کہ سارے علوم انسانی اس سے متاثر ہو کر رہ گئے۔ مذہب، اخلاق، فلسفہ، قانون، معاشیات، سیاسیات، غرض کوئی ذہنی موضوع ایسا نہ تھا جس نے گہرے طور پر اس سے اثر قبول نہ کیا ہو۔ فطری طور پر یہ اثر یک طرفہ تھا۔ فکری علوم سائنس کے اوپر اپنی چھاپ نہ ڈال سکے، وہ صرف سائنس کے عمومی غلبہ کا شکار ہو کر رہ گئے۔

سائنس اپنی ابتدائی شکل میں فکری علوم کی موافق تھی، نہ کہ مخالف۔ انسان اگر نظام شمسی کی حرکت کا نقشہ معلوم کرلے، یا آٹو میٹک مشین کے ذریعے کام لینے لگے تو اس میں اخلاق یا انسانی اقدار سے ٹکراؤ کا پہلو کیا ہے۔ تاہم سائنس کے ظہور کے ساتھ چند باتیں ایسی پیش آئیں جنھوں نے سائنس کو فکری علوم، خاص طور پر مذہب واخلاق سے متصادم کر دیا۔

1۔ مذہب کے ماننے والوں نے سائنس کے ظہور سے پہلے روایتی معلومات کے تحت اپنا ایک فکری نظام بنا رکھا تھا۔ سائنس کی دریافتیں سامنے آئیں تو معلوم ہوا کہ ان میں سے بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو سائنس کی معلوم کردہ دنیا سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ اب چونکہ سائنس زیادہ ترقی یافتہ ذرائع معلومات کے حوالے سے کلام کر رہی تھی۔ قدرتی طور پر سمجھا گیا کہ وہی بات صحیح ہے جو سائنس کی طرف سے آئی ہے۔ اس واقعہ نے مذہب کو لوگوں کی نظر میں بے اعتبار بنا دیا۔ اس میں مزید شدت اس واقعہ سے پیدا ہوئی کہ اہل مذہب، خصوصاً عیسائی حضرات نے اپنے روایتی عقائد کے تحفظ کے لیے سائنس کے خلاف نہایت سخت رویہ اختیار کیا۔

ماڈرن سائنس کا آغاز واضح صورت میں سولہویں صدی میں ہوا۔ مگر یہ ایک اتفاقی بات تھی کہ اپنے ابتدائی زمانہ میں سائنسدانوں نے عالم فطرت کے جو حقائق دریافت کیے وہ زوال یافتہ مسیحیت کے

مزعومہ عقائد سے ٹکراتے تھے۔ مسیحیت کے پیشواچوں کہ اس وقت اقتدار کی حالت میں تھے، اُنہوں نے ان سائنس دانوں کی سخت مخالفت کی اور انہیں سخت سزائیں دیں۔ اس کی تفصیل ولیم ڈریپر (وفات 1882ء) کی کتاب "معرکۂ مذہب وسائنس کی تاریخ" میں دیکھی جاسکتی ہے:

History of the Conflict between Religion and Science by John William Draper, London, 1875.

مسیحی پیشواؤں کے اس اقدام نے عام لوگوں میں یہ تاثر پیدا کیا کہ یہ ٹکراؤ حقیقت میں مذہب اور سائنس کا ٹکراؤ ہے، اور جب دلائل کی منطق صریح طور پر سائنس کی طرف ہے تو یقیناً مذہب ایک بے اصل چیز ہے۔ مذہب کی حقیقت توہم پرستی (superstition) کے سوا اور کچھ نہیں۔ یعنی یہ ٹکراؤ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اہل سائنس اور اہل مذہب کے درمیان تھا۔ مگر غلط طور پر اس کو سائنس اور مذہب کا ٹکراؤ سمجھ لیا گیا۔ اُس وقت جذباتی ہیجان کی بنا پر اس فرق کو سمجھا نہ جاسکا اور سائنسی تہذیب غلط طور پر اپنے آغاز ہی میں عملاً ایک مخالفِ مذہب تہذیب کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سائنسی تہذیب کے لوگ مذہب کو اپنا حریف سمجھنے لگے اور اہل مذہب نے سائنس کو اپنا دشمن فرض کرلیا۔ یہ منفی ذہن ابتداً مسیحیت کے مقابلہ میں پیدا ہوا۔ اس کے بعد وہ توسیع پا کر دوسرے مذاہب تک پہنچ گیا۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ زمین اور سورج کی گردش کے بارے میں قدیم یونان میں دو نظریے پیش کیے گئے تھے۔ ایک ارسطو کا نظریہ جس کا مطلب یہ تھا کہ زمین قائم ہے اور سورج اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ دوسرا ارسٹاکس (Aristarchus) کا نظریہ جس کے مطابق زمین سورج کے گرد گھوم رہی تھی۔

عیسائیوں کے درمیان ارسطو کا نظریہ بہت مقبول ہوا۔ کیوں کہ مرکزیت زمین کے نظریہ (Geocentric Theory) میں زمین کو بنیادی اہمیت حاصل ہو رہی تھی اور چونکہ انھوں نے حضرت مسیح کو خدائی کا مقام دے رکھا تھا۔ اس لیے ان کا خیال یہ ہو گیا کہ وہی کرہ نظام شمسی کا مرکز بن سکتا ہے جہاں خداوند مسیح پیدا ہوئے ہیں۔ حتی کہ مرکزیت زمین کے نظریہ کو انھوں نے اپنے علم کلام میں داخل کرلیا۔ کوپرنیکس (1473-1543ء) نے جب مرکزیت آفتاب کا نظریہ

(heliocentric theory) پیش کیا تو یورپ کے عیسائی پیشواؤں کو اقتدار حاصل تھا۔ انھوں نے اپنے عقیدہ کے تحفظ کے لیے کوپرنیکس کے خلاف عدالتی سزا کا حکم جاری کر دیا۔ خداوند کی جنم بھومی کو تابع (satellite) قرار دینا ایک ایسا جرم تھا جو کسی طرح معاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔

مگر یہ مسئلہ روایتی عیسائیت کا تھا، نہ کہ حقیقی معنوں میں خدائی مذہب کا۔ چنانچہ مسلمان جو اس اعتقادی پیچیدگی میں مبتلا نہ تھے کہ پیغمبر کو خدا سمجھیں، انھوں نے مرکزیت آفتاب کے نظریہ کو زیادہ معقول پا کر اسے قبول کر لیا۔ ان کے یہاں یہ سوال نہیں اٹھا کہ شمسی مرکزیت کا نظریہ مذہبی تعلیمات سے ٹکراتا ہے۔ امریکی رائٹر ایڈورڈ برنس نے لکھا ہے:

"ارسطو کے احترام کے باوجود عرب کائنات کے بارے میں ارسطو کے نظریہ پر تنقید کرنے میں نہیں ہچکچائے، جس کا مطلب یہ تھا کہ زمین آسمانی اجرام (celestial bodies) کا مرکز ہے اور تمام اجرام اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ اس کے برعکس، عربوں نے اس امکان کو تسلیم کیا کہ زمین اپنے محور پر گردش کرتی ہوئی سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔"

Edward McNall Burns: Western Civilization, p. 264

2۔ دوسری غلطی سائنس دانوں یا کم از کم سائنس کے حوالے سے بولنے والوں نے کی۔ عالم طبیعیات میں اپنی دریافت سے وہ اس غلط فہمی میں پڑ گئے کہ وہ اس حیثیت میں ہیں کہ وسیع تر فلسفیانہ مسائل کے بارے میں رائے زنی کر سکیں۔ حالاں کہ، جیسا کہ بعد کو خود سائنس کی مزید دریافتوں سے معلوم ہوا، عالم طبیعی کے بارے میں ان کے مشاہدات، فلسفہ یا عالم افکار کے نازک مسائل کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کے لیے انتہائی ناکافی تھے۔

سائنس دانوں کی غلطی کی ایک مثال اصول تعلیل (causation) میں ملتی ہے۔ اشیاء کے مشاہدہ سے جب یہ حقیقت ان کے سامنے آئی کہ واقعات کے پیچھے ایک سبب کارفرما ہوتا ہے، مثال کے طور پر اجرام سماوی (celestial bodies) کی گردش کے پیچھے جذب و کشش کا قانون (law of gravitation) یا قوس قزح (rainbow) کے پیچھے بارش کے قطرات سے سورج کی شعاعوں کا گزرنا ہے، تو انھوں نے سمجھ لیا کہ ان کو اس سوال کا جواب مل گیا ہے جس کے لیے فلسفہ

ہزاروں سال سے "علت کائنات" کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ حالاں کہ علت کائنات کا مسئلہ نہایت گہرے سوالات سے جڑا ہوا تھا اور سائنس دانوں کا طبیعی مشاہدہ کسی بھی درجہ میں اس قابل نہ تھا کہ اس کو اس نازک اور گہرے سوال کے جواب کے لیے استعمال کیا جائے۔ تاہم انھوں نے استعمال کیا۔ حتی کہ اس کو خالق کے انکار کا سب سے بڑا ثبوت سمجھ لیا۔ مگر بیسویں صدی کے آغاز میں خود سائنس نے ایسے حقائق دریافت کیے جس کے بعد الحاد کی یہ بنیاد ہمیشہ کے لیے منہدم ہوگئی۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو یہ دو کتابیں "مذہب اور جدید چیلنج" اور "مذہب اور سائنس" مطبوعہ گڈ ورڈ بکس، دہلی)۔

یہ ہے مختصر طور پر وہ فکری پس منظر جس میں جدید تاریخ کا وہ واقعہ وجود میں آیا جس کو مذہب اور سائنس کا تصادم کہا جاتا ہے۔

امت مسلمہ

سائنس نے جدید دور کے ہر پہلو پر اتنی شدت اور وسعت کے ساتھ اثر ڈالا کہ علم کے تمام شعبوں اور فکر کے تمام گوشوں پر اس کی چھاپ پڑ گئی جس قدیم روایتی ڈھانچہ میں لوگوں نے اسلام کو پایا تھا، وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ چکا تھا اور نیا فکری ڈھانچہ جو سائنس کے زیر اثر بنا، اس کے تحت اسلامی افکار کی تشکیل نو نہ کی جا سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نسل کی نسل کنفیوزن اور انتشار ذہنی کا شکار ہو کر رہ گئی۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس دور میں ایسے لوگ معدوم ہو گئے جو اسلام کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہوں۔ بلاشبہ ایسے لوگ تھے اور کروروں کی تعداد میں تھے۔ مگر انھوں نے اسلام کو روایتی سطح پر پایا تھا، شعور کی سطح پر نہیں پایا تھا۔ اس کمی کا نتیجہ صرف یہ نہیں ہوا کہ لوگ ایمان کی اس اعلیٰ فکری سطح کو نہ پہنچ سکے جہاں آدمی گرد و پیش کے تمام واقعات کو اس طرح اپنے شعور حق کا جزء بنا لیتا ہے کہ ہر طرف اس کو خدا کا جلوہ دکھائی دینے لگتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ بڑا اجتماعی نقصان یہ ہوا کہ اس دور میں مسلمانوں کے جو مذہبی رہنما اٹھے، وہ خود بھی چونکہ ایسے تھے جنھوں نے فکر حاضر میں اپنے دین کو نہیں پایا تھا، بلکہ ماضی کے روایتی ڈھانچہ میں پایا تھا، اس لیے وہ دور جدید کے مطابق اسلامی مہم کی منصوبہ بندی نہ کر سکے۔ انتہائی اخلاص مگر غیر شعوری طور پر نادانی کے ساتھ وہ مسلمانوں کو ایسی راہوں میں دوڑاتے رہے جن کی ساری قیمت

ماضی کے نقشہ میں تھی، عہد حاضر کے نقشہ میں وہ غیر متعلق (irrelevant) ہو چکے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم ملت کی ناکامی میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔ ہر محاذ پر ان کو شکست ہوئی اور شکست نے بالآخر مسلم ملت کو مایوسی اور جھنجلاہٹ اور بے حوصلگی کا شدید تر تحفہ دے کر زوال کے کنارے پہنچا دیا۔

شعوری سطح پر دین کو پانے کا مطلب وقت کے افکار کے مقابلے میں دین کو پانا ہے۔ مثلاً معرکہ بدر (625ء) کے اہل اسلام نے اللہ کے حکم "اور ان کے لیے جس قدر تم سے ہو سکے تیار رکھو قوت" (8:60) کی تفسیر "تلوار" میں پائی تھی۔ مگر شاملی کے معرکہ (1857ء) میں شامل ہونے والے مسلمان بھی اگر آیت کی تفسیر "تلوار" میں پائیں تو کہا جائے گا کہ انھوں نے قرآن کو عہد حاضر کی نسبت سے نہیں پایا۔ آج اس آیت کی تفسیر کو تلوار کی شکل میں پانا، قرآن کو گزرے ہوئے ماضی کے نقشہ میں پانا ہے۔ جب کہ اجتہاد کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کو وقت کے نقشہ میں پایا جائے۔

خیالات کے اظہار کے لیے شعر و خطابت کی زبان استعمال کرنا، احیائے اسلام کی تحریکوں کا سیاسی رخ اختیار کرنا، وعظ خوانی اور فتوے کو اصلاح امت کے لیے کافی سمجھنا سب اسی کے مظاہر ہیں۔ یعنی ماضی کے طریقِ کار کو حال میں دہرانا۔

دور جدید میں ہمارے جو مصلحین اٹھے انھوں نے اگر فکر حاضر میں اپنے اسلامی شعور کو پایا ہو تا تو وہ جانتے کہ وہ کون سے افکار و عوامل ہیں جو آج فیصلہ کن بن گئے ہیں اور ان کے مقابلہ میں احیائے اسلام کی منصوبہ بندی کس طرح ہونی چاہیے۔ اس کے بجائے مسلم رہنماؤں نے جو کیا، وہ یہ تھا کہ ان کے پاس صرف روایتی عقیدہ کا سرمایہ تھا۔ بس اسی کو لیے ہوئے وہ وقت کے سمندر میں کود پڑے، بدلے ہوئے زمانے میں اس قسم کا جوشِ ایمان انھیں کہیں نہیں پہنچا سکتا تھا اور نہ اس نے کہیں پہنچایا۔

انیسویں صدی میں یہ بات پوری طرح نمایاں ہو چکی تھی کہ مذہب کا روایتی ڈھانچہ اس جدید ڈھانچہ (framework) میں اپنی جگہ نہیں پا رہا ہے جو سائنس کے زیر اثر بنا ہے۔ اس وقت ضرورت تھی کہ گہرائی کے ساتھ موجودہ صورت حال کا جائزہ لے کر اس کے مطابق نیا تشریحی فریم ورک تیار کیا جائے جس سے اسلام عصر حاضر میں دوبارہ اپنی جگہ پا سکے۔ اگر بروقت یہ کام ہو جاتا تو سائنس یا دور جدید نہ

صرف یہ کہ مذہب کے حریف نہ بنتے بلکہ اس کو تقویت دے کر اس کو نئی زندگی عطا کرنے والے بن جاتے۔ مگر ایسا نہ ہوسکا۔ عیسائیت نے سیاسی اقتدار سے محرومی کے بعد ماڈرنزم کی شکل میں سائنس سے سمجھوتہ کرلیا۔

اس کے بالمقابل مسلمان ایک محفوظ خدائی دین کے حامل تھے۔ چنانچہ وہ فکری طور پر اس پوزیشن میں تھے کہ جدید تاریخ کے اس اہم کردار کو ادا کرسکیں، جس طرح انھوں نے نویں صدی عیسوی میں بغداد اور قرطبہ میں وقت کی سائنس اور فلسفہ کے مقابلے میں اسی قسم کے کردار کو ادا کیا تھا۔ مگر بدقسمتی سے یہ وہ وقت تھا جب کہ مسلمان قومیں زوال کا شکار ہوچکی تھیں۔ ان کے اندر نہ حوصلہ تھا، نہ فکری بلندی۔ مزید یہ کہ جدید اقتصادیات میں اپنی محرومی کی وجہ سے وہ اس قابل نہ رہے تھے کہ اس قسم کے کسی موثر کام کی قیمت ادا کرسکیں۔ اپنی پس ماندگی کی وجہ سے مسلمان اس کا ثبوت بھی نہ دے سکے کہ وہ وقت کے اس مسئلہ کو صحیح طور پر سمجھتے ہیں۔ کجا کہ ان سے یہ امید کی جائے کہ وہ گہرائی کے ساتھ اس کا جائزہ لیتے اور زندگی کے جدید نقشہ میں مذہب کو اس کا مقام عطا کرتے۔

کرنے کا کام

موجودہ حالات نے ہمارے لیے جو مسائل پیدا کیے ہیں، وہ دو قسم کے ہیں — نظری اور عملی۔

پہلے جزء کے سلسلے میں اہم ترین کام یہ ہے کہ اسلام کے عقائد و احکام کو جدید استدلالی انداز میں مرتب کیا جائے تاکہ وہ لوگوں کو آج کی چیز معلوم ہونے لگیں۔ نہ یہ کہ پڑھنے والا یہ سمجھے کہ وہ اس دور کی چیز ہیں جب کہ انسان قبائلی دور میں جیتا تھا۔

جدید انداز سے مراد یہ ہے کہ اسلوب تحریر اور استدلال دونوں اعتبار سے وہ عصر حاضر کے اعلیٰ معیار کے مطابق ہو۔ موجودہ زمانے میں اسلوب تحریر مکمل طور پر بدل گیا ہے۔ قدیم روایتی اسلوب میں خطیبانہ انداز غالب ہوتا تھا۔ اب سائنسی اور تجزیاتی انداز کو پسند کیا جاتا ہے۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ عبارت کے درمیان اشعار نقل کر دینا۔ زورِ الفاظ کا مظاہرہ کرنا یا مسجع فقرے لکھنا، نفسِ مضمون کی قیمت میں اضافہ کرتا ہے۔ اب یہ ساری چیزیں معیوب قرار پا چکی ہیں۔ قدیم تصور ادب میں تیر ونشتر قسم کے جملے، فریقِ مخالف کے اوپر تیز تیز ریمارک، جذباتی قسم کی عبارتیں انتہائی

پسندیدہ ہوتی تھیں۔ مگر اب یہ تمام چیزیں علمی وقار کے خلاف سمجھی جاتی ہیں۔ قدیم ذوق کے مطابق مبالغہ آمیز الفاظ، رنگین ترکیبیں اور استعارے اور تشبیہات ادب کا کمال سمجھے جاتے تھے۔ مگر اب کوئی تعلیم یافتہ آدمی اس قسم کے مضمون کو پڑھنا بھی پسند نہیں کرتا۔

یہی کیس طریقِ استدلال کا بھی ہے۔ پہلے زمانے میں کسی چیز کو ثابت کرنے کے لیے یہ بھی کافی تھا کہ آدمی اپنے نقطۂ نظر کے حق میں ایک تصوراتی مثال پیش کردے یا ایک حکایت بیان کردے۔ مگر اب اس کو غیر معتبر سمجھا جاتا ہے کہ کوئی شخص اس قسم کی چیزوں سے اپنی بات ثابت کرنے لگے۔ پہلے زمانے میں کسی حوالے کے لیے اعدادی قطعیت یا واقعاتی تعین ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا، مگر جدید ذوق کے لیے وہ کلام بے معنی ہے جس میں تعیناتی زبان استعمال نہ کی گئی ہو۔ قدیم طریقے میں استدلال کی بنیاد تمام تر قیاسی منطق ہوا کرتی تھی۔ مگر اب قیاسی منطق بے قیمت ہوگئی ہے۔ اب تاریخی، مشاہداتی اور تجزیاتی انداز میں بات کو ثابت کرنا معتبر مانا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں آدمی مناظر اور مبلغ بن کر ایک وکیل کی طرح بالکل برہنہ انداز میں (فریقِ ثانی کی ذاتیات پر حملہ کرتے ہوئے) اپنے نقطۂ نظر کو ثابت کرتا تھا۔ اب موضوعی تجزیہ (objective analysis) کو معیاری انداز سمجھا جاتا ہے۔

پچھلے سو برس میں ہمارے یہاں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے بہت سی کتابیں بجائے خود قیمتی بھی ہیں۔ مگر دورِ جدید کے اعتبار سے ان کی افادیت محض جزئی ہے۔ کیوں کہ وہ قدیم طرز کے مطابق خطیبانہ نثر کا نمونہ ہیں۔ سائنسی طرز استدلال پر تحریری کام ابھی تک ہمارے یہاں تقریباً صفر کے درجے میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ نوجوان اسلام کو سمجھنے کے لیے بھی مستشرقین کی کتابیں پڑھتے ہیں جو، خواہ ہمارے نزدیک غلط ہوں، تاہم وہ اپنے انداز اور اسلوب کے اعتبار سے جدید معیار کی حامل ہوتی ہیں۔

اس کے بالمقابل مسلم مصنفین کی لکھی ہوئی کتابیں ان کو اپیل نہیں کرتیں۔ عملی مسائل کی فہرست، جن کے حل کے لیے وقت کے نظام اجتماعی میں تغیر ضروری ہے، بہت طویل ہے۔ وقت کا اجتماعی نظام، قومی اور بین اقوامی دونوں اعتبار سے، سراسر انسانی فکر کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے دین کے اجتماعی قوانین پر عمل کرنا ممکن نہیں رہا ہے۔ مگر یہاں اسلام نے جو

راہ عمل تجویز کی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو ایک انقلاب پسند لیڈر عام طور پر اختیار کرتا ہے۔

اس کا حل موجودہ زمانے کی اسلامی جماعتوں نے یہ نکالا ہے کہ نظام حاضر سے ٹکرا جائیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ اجتماعی ایمان اگر ہمیں حاصل نہیں تو اس کے حصول کی خاطر موت تو ہمارے بس میں ہے۔ پھر کیوں نہ ہم" بے ایمان" ، زندگی کے مقابلے میں" باایمان" موت کو ترجیح دیں۔ اس کے نتیجہ میں جو خطرناک ظاہرہ مسلم نوجوانوں کے درمیان پیدا ہوا تھا، وہ تھا جہاد بمعنی قتال اور سوسائڈ بامبنگ۔

یہ دونوں عمل اپنی حقیقت کے اعتبار سے مکمل طور پر غیر اسلامی عمل تھے، نہ کہ اسلام کی کوئی خدمت۔ یہ غلط فہمی اس لیے پیدا ہوئی کہ اس دور میں اٹھنے والے مصلحین امت اس نکتے کو نہ سمجھ سکے کہ مکہ میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کی دعوت کا حکم دیا گیا تو یہ نہیں کہا گیا کہ مکہ کی پارلیمنٹ (دارالندوہ) میں نمائندگی حاصل کرنے کا مطالبہ کرو، یا کعبہ کی تولیت پر قبضہ کرنے کی کوشش کرو۔ بلکہ توحید اور مواساۃ بنی آدم سے متعلق سادہ تعلیمات بھیجی گئیں اور حکم ہوا کہ لوگوں کو ان سے باخبر کرو۔ اس سے آگے کی چیزیں، جن کے حصول کے لیے اجتماعی انقلاب ضروری ہے، ان کے بارے میں قرآن میں حکم دیا گیا کہ اس معاملے میں ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کرنے بجائے ان کو برداشت کرو، اور اس وقت کا انتظار کرو جب اللہ حالات میں ایسا تغیر فرمائے جب کہ بقیہ مسائل کے حل کی راہ نکل سکے (10:102)۔

اس معاملہ میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ ممکن دائرہ میں دین پر عمل کرتے ہوئے دعوتی جدوجہد شروع کر دو اور بقیہ تمام امور کو نصرت الٰہی کے خانہ میں ڈال دو۔ یہی مطلب ہے حکم دعوت کے بعد یہ کہنے کا کہ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (74:7)۔ یعنی، اور اپنے رب کے لیے صبر کرو۔

زمانہ حال کے تقاضوں سے باخبر ہو کر دین کی بنیادی تعلیمات سے لوگوں کو پرامن انداز میں آگاہ کرنا اور اس راہ میں جو مشکلات و مسائل پیش آئیں، ان پر صبر کرنا، یہی تمام انبیاء کا طریقہ رہا ہے اور یہی آج بھی ان لوگوں کا طریقہ ہونا چاہیے جو نا موافق ماحول میں اسلام کی تعلیم سے اللہ کے بندوں کو آگاہ کرنے کے لیے اٹھیں (بحوالہ الرسالہ، دسمبر 1976)۔

ڈائلاگ اسلام میں

ڈائلاگ یا مکالمہ دو شخصیتوں یا دو پارٹیوں کے درمیان بات چیت (conversation) کا نام ہے۔ ڈائلاگ (dialogue) کا مقصد یہ ہے کہ کسی اختلافی مسئلے کا پرامن حل تلاش کیا جائے:

A discussion between representatives of parties to a conflict that is aimed at finding a resolution.

ڈائلاگ دور جدید کا ظاہرہ ہے، قدیم بادشاہی دور میں آزادانہ ڈائلاگ کا رواج نہ تھا۔ جب دنیا میں ڈیما کریسی آئی تو فطری طور پر لوگوں کے درمیان آزادانہ ڈائلاگ ہونے لگا۔ یہ ڈائلاگ سیاسی سطح پر بھی جاری ہوا، اور غیر سیاسی سطح پر بھی۔

ڈائلاگ دراصل انسانی سماج کو حیوانی سطح سے اٹھا کر انسانی سطح میں لانے کا نام ہے۔ انسانوں کے درمیان اختلاف ایک فطری چیز ہے۔ قدیم زمانے میں لوگ اختلاف کی باتوں پر لڑ جاتے تھے۔ وہ اختلاف کو طے کرنے کا ایک ہی طریقہ جانتے تھے، اور وہ لڑائی تھی۔ لیکن ڈیما کریسی نے اس طریقے کو ختم کر دیا، اور انسان کو جنگل کلچر کے دور سے نکال کر امن کلچر کے دور میں پہنچایا۔

ڈائلاگ یا پرامن مکالمے کا طریقہ عین اسلام کا طریقہ ہے۔ اسلام کی بنیاد دعوت کے اصول پر قائم ہے، اور دعوت پرامن گفت وشنید (discussion) کا دوسرا نام ہے۔ اسلام میں تشدد مکمل طور پر حرام عمل ہے (المائدہ، 5:32-33)۔ اس سے صرف ایک استثناء ہے، اور وہ دفاع ہے (الحج، 22:39)۔ یہ دفاع (defence) خارجی حملے کے وقت ہوتا ہے۔ اور دفاع کا یہ کام بھی صرف باقاعدہ طور پر قائم شدہ حکومت کر سکتی ہے (صحیح مسلم، حدیث نمبر 1841)۔ غیر حکومتی تنظیم دفاع یا انصاف کے نام پر متشددانہ لڑائی لڑنے کا حق نہیں رکھتی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے 610 عیسوی میں عرب میں اپنا مشن شروع کیا۔ یہ مشن کیا تھا۔ وہ مشن یہ تھا کہ آپ اپنی آئیڈیالوجی کو لے کر لوگوں میں جائیں اور لوگوں سے اس کے بارے میں بات چیت کریں۔ ان کے اعتراضات کو سنیں اور دلیل کے ذریعے اپنے نقطۂ نظر پر انھیں مطمئن کرنے

کی کوشش کریں۔ پیغمبر اسلام پر جب وحی اترنا شروع ہوئی تو اس کے آغاز میں ہی آپ پر یہ آیت اتری: وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (37:11)۔ یعنی خدا کی طرف سے آپ کو جو نظریۂ حیات دیا گیا ہے، لوگوں کے درمیان اس کا چرچا کریں۔ آپ کا نظریۂ حیات توحید پر مبنی تھا، جب کہ اس وقت عرب کے لوگ شرک پر عقیدہ رکھتے تھے۔ اس لیے فطری طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن دوطرفہ گفت وشنید کا موضوع بن گیا۔ آپ لوگوں سے اپنی بات کہتے اور لوگوں کا ردعمل سنتے اور پھر اس کی مزید وضاحت کرتے۔ اسی طرح آپ کا مشن عملاً وہی چیز بن گیا جس کو موجودہ زمانے میں ڈائلاگ کہا جاتا ہے۔

دورِ جدید کو دور ڈائلاگ بھی کہا جاسکتا ہے۔ مگر میرا تجربہ ہے کہ اکثر لوگ مناظرہ (debate) اور ڈائلاگ میں فرق نہیں کرتے۔ وہ ڈائلاگ کے نام پر سیمینار کرتے ہیں اور پھر وہاں ڈبیٹ کرنے لگتے ہیں۔ ڈائلاگ کا مقصد کامن گراؤنڈ تلاش کرنا ہوتا ہے، جب کہ ڈبیٹ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ فریقِ ثانی پر اپنی برتری کو ثابت کیا جائے۔ سب سے پہلے اِس سوچ کو بدلنا چاہیے۔ اس کے بعد ہی کوئی ڈائلاگ مفید ہوسکتا ہے۔

ڈائلاگ کے عمل کو کارآمد بنانے کے لیے قرآن میں کچھ مفید اصول بتائے گئے ہیں۔ ان اصولوں میں سے کچھ اصولوں کا ہم یہاں تذکرہ کریں گے۔

1۔ اس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یہ ہے: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (16:125)۔ یعنی، اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ، اور ان سے اچھے طریقے (جدالِ احسن) سے ڈسکشن کرو۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ دوسروں سے تم جو گفتگو کرو وہ 'جدالِ احسن' کے طریقے پر ہو۔ یعنی فریقِ ثانی سے تکرار نہ کرنا، بلکہ اس کے اختلاف کو سن کر سنجیدگی کے ساتھ ایسی بات کہنا جو اس کے مائنڈ کو ایڈریس کرنے والی ہو۔ گفتگو محض بحث ومباحثے پر ختم نہ ہو بلکہ وہ ایک نتیجہ خیز انجام پر ختم ہو۔ بات چیت کے دوران حریفانہ اور رقیبانہ انداز اختیار نہ کیا جائے بلکہ علمی انداز اختیار کیا جائے۔

2۔ اس سلسلے میں دوسری آیت یہ ہے: وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ (41:34)۔ یعنی، اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں

تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو۔ پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔

قرآن کی اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ کوئی آدمی مسٹر دشمن نہیں۔ ہر آدمی امکانی طور پر مسٹر دوست ہے۔ اس لیے کہ ہر آدمی ایک ہی فطرت پر پیدا کیا گیا ہے، کئی فطرت پر نہیں۔ اس قرآنی اصول سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈائلاگ کا آغاز اس طرح نہیں ہونا چاہئے کہ پہلے ہی سے دونوں فریق ایک دوسرے کے بارے میں ناامید بنے ہوئے ہوں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ڈائلاگ کا عمل پرامید ذہن کے ساتھ کیا جائے، نہ کہ ناامیدی اور مایوسی کے ذہن کے ساتھ۔

3۔ اس سلسلے میں قرآن کی ایک اور آیت یہ ہے: قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللهَ (3:64)۔ یعنی، اے اہلِ کتاب، آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان مشترک ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دو فریق کے درمیان بات چیت ہو تو اس وقت موضوع گفتگو کا انتخاب کس طرح کیا جانا چاہیے۔ وہ یہ کہ گفتگو کا آغاز اختلافی پہلو کو لے کر نہ کیا جائے، بلکہ دونوں فریقوں کے درمیان کامن گراؤنڈ (کلمہ سواء) تلاش کیا جائے اور اس کامن گراؤنڈ سے گفتگو کا آغاز کیا جائے۔ یعنی گفتگو کا طریقہ اختلاف سے اتفاق کی طرف نہ ہو بلکہ اتفاق سے اختلاف کی طرف ہو۔

4۔ اس سلسلے میں ایک اور قابلِ حوالہ آیت یہ ہے: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ فَيَسُبُّوا اللهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (6:108)۔ یعنی، اور خدا کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں ان کو تم برا بھلا نہ کہو ورنہ یہ لوگ حد سے گزر کر جہالت کی بنا پر خدا کو برا بھلا کہنے لگیں گے۔

قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دو فریقوں کے درمیان ایک اختلافی موضوع پر ڈائلاگ ہو تو ضروری ہے کہ ڈائلاگ کے باہر موافقِ ڈائلاگ فضا کو باقی رکھا جائے۔ اگر ایسا ہو کہ دونوں فریقوں کا میڈیا ایک دوسرے کے خلاف نفرت کی باتیں پھیلا رہا ہو۔ دونوں طرف کے لوگ ایسی باتوں کا چرچا کرنے میں مصروف ہوں جس سے ایک دوسرے کے خلاف معاندانہ جذبات پیدا ہوتے ہیں تو ایسی غیر موافق فضا میں مفید ڈائلاگ نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ڈائلاگ کے

نتیجہ خیز ہونے کا تعلق، صرف کمرۂ ڈائلاگ کی بات چیت پر منحصر نہیں ہوتا، بلکہ اس پر منحصر ہوتا ہے کہ کمرۂ ڈائلاگ کے باہر جو فضا بنائی گئی ہے وہ ڈائلاگ کے حق میں ہے یا اس کے خلاف ہے۔

ڈائلاگ کا ایک اور اصول وہ ہے جو سنتِ رسول سے ثابت ہوتا ہے، یہ اصول حدیبیہ کے معاہدے سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ معاہدہ پیغمبر اسلام اور قریش کے درمیان لمبی بات چیت کے بعد طے پایا تھا۔ جیسا کہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے، یہ معاہدہ اس طرح ممکن ہوا کہ پیغمبر اسلام نے قریش کی کئی شرطوں کو یک طرفہ طور پر مان لیا۔ پیغمبر کی اس سنت سے ڈائلاگ کا یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ دونوں فریق اپنے اپنے نقطہ نظر کو دلیل کے ساتھ پیش کریں۔ لیکن اسی کے ساتھ دونوں اس بات کے لیے تیار رہیں کہ ڈائلاگ ہمیشہ لینے اور دینے (give and take) کے اصول کو اختیار کرکے کامیاب ہوتا ہے نہ کہ صرف لینے کے اصول پر اصرار کرنے سے۔ عملی معاملات میں اسلام آخری حد تک لچک کے اصول کو پسند کرتا ہے۔

اسلامی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا کہ اسلام میں صرف ڈائلاگ کے اصول نہیں بتائے گئے ہیں بلکہ ڈائلاگ کے اصول کا عملی تجربہ بھی بار بار کیا گیا ہے۔ اسلامی تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

پیغمبر اسلام نے اپنے مشن کے مکی دور میں بار بار ڈائلاگ کے اصول پر عمل کیا۔ مثلاً ایک بار قریش نے اپنے سردار عقبہ بن ربیعہ کو اپنا نمائندہ بنا کر پیغمبر اسلام کے پاس بھیجا تاکہ باہمی اختلاف کے موضوع پر بات چیت کرکے صلح کا ماحول بنایا جائے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عقبہ نے نہایت غور کے ساتھ آپ کی باتیں سنیں اور قریش کے پاس جاکر انھیں اس سے آگاہ کیا۔ اسی طرح ایک بار آپ کے چچا ابو طالب کی دعوت پر آپ اور قریش کے نمائندے اکٹھا ہوئے اور اختلافی موضوعات پر پرامن انداز میں بات چیت ہوئی۔

اسی طرح حدیبیہ کے موقع پر پیغمبر اسلام اور قریش کے درمیان ایک گفت وشنید ہوئی۔ اس کا سلسلہ تقریباً دو ہفتے تک جاری رہا۔ اس کے بعد دونوں فریقوں کے درمیان وہ معاہدۂ طے پایا جس کو معاہدۂ حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ یہ واقعہ بلاشبہ پرامن ڈائلاگ کی ایک کامیاب مثال ہے۔

اسی طرح پیغمبر اسلام کی موجودگی میں تین مذاہب — اسلام، مسیحیت اور یہودیت کے نمائندوں کے درمیان ٹرائلاگ ہوا (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 549)۔ یہ ٹرائلاگ (trialogue) مدینہ کی مسجد نبوی میں ہوا۔ عرب مصنّفین نے اس کو مؤتمر الأدیان الثلاثۃ کا نام دیا ہے۔ یعنی تین مذہبوں کے درمیان ٹرائلاگ۔ غالباً یہ تاریخ کا پہلا ٹرائلاگ تھا جو مقدس عبادت خانے کے اندر ہوا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں پرامن گفت وشنید کو کتنی زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

اسلام کی تاریخ میں اس طرح کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ یہ مثالیں اس معیاری زمانے سے تعلق رکھتی ہیں، جس کو عہد نبوت اور عہد صحابہ کہا جاتا ہے۔ اس لیے ڈائلاگ یا باہمی گفت وشنید کے اصول کو اسلام میں ایک مستند اصول کی حیثیت حاصل ہے۔

خلاصۂ کلام

اسلام کا طریقہ پرامن ڈائلاگ کا طریقہ ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ صلح کا طریقہ سب سے بہتر طریقہ ہے (4:128)۔ اسی طرح ایک اور آیت میں آیا ہے کہ اختلاف کے موقع پر باہمی گفت وشنید اور ثالثی (negotiation and mediation) کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے (4:35)۔ حدیث میں آیا ہے کہ دشمن سے مڈبھیڑ کی خواہش نہ کرو بلکہ اللہ سے عافیت مانگو (لَا تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ، وَسَلُوا اللّٰهَ الْعَافِيَةَ) صحیح البخاری، حدیث نمبر 7237۔

اسلام کا مقصد ربانی انقلاب لانا ہے۔ لوگوں کو خدا پرستانہ زندگی کی طرف بلانا ہے۔ ایک ایسا سماج بنانا ہے جہاں روحانی اور اخلاقی اور انسانی قدروں کا رواج ہو۔ اسلام ایک ایسے ماحول کا داعی ہے جہاں امن اور ٹالرنس اور محبت اور خیر خواہانہ تعلقات کا مزاج لوگوں کے اندر پایا جائے۔ جہاں نزاعات کو تشدد کے بغیر حل کیا جائے۔ یہی اسلام کی مطلوب دنیا ہے۔ ایسی دنیا صرف پرامن ڈائلاگ کے ذریعے ہی قائم کی جاسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام عقیدے کے اعتبار سے توحید پر قائم ہے اور طریقِ کار کے اعتبار سے پرامن ڈائلاگ پر۔ یہی اسلامی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ اس کے سوا جو طریقہ ہے اس کو اسلام کا طریقہ نہیں کہا جاسکتا (6 جون 2006)۔

ڈائری 1986

28 مارچ 1986

جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد صاحب نے 6 مارچ 1986ء کو ایک تقریر کی۔ لاہور کے جلسۂ عام میں خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مذہبی مزاج کی حامل تمام سیاسی جماعتوں کو اتحاد اور اشتراک عمل کے ساتھ اسلام کے لیے کام کرنا چاہیے۔ میاں طفیل محمد صاحب نے اپنی اس تقریر میں مزید یہ بات کہی:

''آپ جماعت اسلامی کے ساتھ مل کر کام کریں'' (میثاق، اپریل 1986ء)

یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ پہلی بات اگر دعوتِ اتحاد ہے تو دوسری بات دعوتِ انضمام (invitation of merger)۔ پہلی بات کے مطابق لوگوں کو ایک مشترک نظریاتی پلیٹ فارم پر اکٹھا ہو جانا چاہیے۔ جب کہ دوسری بات کا مطلب یہ ہے کہ تمام لوگ اس تنظیم کے پلیٹ فارم پر اکٹھا ہو جائیں جس کا نام جماعت اسلامی ہے۔

موجودہ زمانہ میں ہر مسلمان لیڈر اتحاد کا لفظ بولتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ اتحاد کیا ہے اور وہ کس طرح قائم ہوتا ہے۔

''انضمام'' کی نوعیت کا اتحاد صرف اس وقت قائم ہوتا ہے جب کہ آپ تمام لوگوں کو صد فی صد اپنا ہم خیال بنا چکے ہوں۔ مگر اتحاد کی یہ صورت اتنی نادر ہے کہ وہ تقریباً ناقابل حصول ہے۔ عام حالات میں اتحاد کی صورت صرف یہ ہے کہ لوگوں کے اندر اتنی ذہنی وسعت ہو کہ وہ اختلاف کے باوجود متحد ہو سکیں۔ اتحاد کی یہی صورت ہے جس کو انگریزی میں ایک جملہ میں اس طرح ادا کیا گیا ہے:

we agree to differ

میں نے اس پر اتفاق کر لیا ہے کہ ہمارے درمیان اختلاف ہے۔

29 مارچ 1986

شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلہ (اپریل 1985ء) کے بعد مسلم قائدین نے اپنی

تقریر سے ہندستان کے مسلمانوں میں کافی جوش پیدا کر دیا۔اس احتجاجی تحریک کے ایک بڑے قائد، جو ایک معروف عالم دین ہیں، کے الفاظ میں تحریک خلافت کے بعد دوسری بار ایسا ہوا ہے کہ مسلمانوں نے اتنے بڑے پیمانے پر مظاہرہ کیا ہے۔انھوں نے مزید کہا کہ یہ ایک زلزلہ انگیز اور انقلاب انگیز مسئلہ تھا اور مسلمانوں کو حق تھا کہ وہ اس کے بارے میں بے چین ہو جائیں۔

مسلمانوں کے پرشور مظاہرہ کا ردعمل ہوا اور ملک کے انگریزی اور ہندی اخبارات میں کافی مضامین شائع ہوئے۔

اس سلسلے میں انگریزی اور ہندی اخبارات کے رویہ پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے مذکورہ عالم دین نے کہا کہ برادران وطن نے احساس تناسب کھو دیا ہے۔یہ کون سا کرائسس ہے جس کے لیے انگریزی اور ہندی اخبارات اپنے قیمتی کالم لگائے ہوئے ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ اب کوئی دوسرا مسئلہ ہی نہیں۔فسادات میں کتنی ہی عورتیں بے سہارا، بیوہ اور لاوارث ہو گئیں، مگر ان کے لیے ہمدردی کا کبھی ایک لفظ بھی شائع نہ ہوا! (نقیب: 24 مارچ 1986ء)

احساس تناسب کھونے کی جو شکایت مولانا موصوف نے ملکی پریس کے خلاف کی ہے وہی خود مزید اضافہ کے ساتھ مولانا موصوف اور ان کے ساتھیوں کا معاملہ بھی ہے۔انہوں نے شاہ بانو کے معاملے میں جو دھوم مچائی ہے، کیا وہی دھوم وہ دوسرے ملی اور دینی معاملات میں بھی مچاتے ہیں؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔پھر جو لوگ خود احساس تناسب کھوئے ہوئے ہوں انہیں کیا حق ہے کہ وہ دوسروں کے بارے میں احساس تناسب کھونے کی شکایت کریں۔

30 مارچ 1986

مہاراشٹر کے سابق چیف منسٹر مسٹر عبدالرحمٰن انتولے نے ہماری تمام مطبوعات منگوائی ہیں اور اہتمام کے ساتھ آج کل ان کو پڑھ رہے ہیں۔اس درمیان میں ان کے داماد مسٹر مشتاق انتولے دو بار بمبئی سے دہلی آئے۔اور دونوں بار جناب عبدالرحمٰن انتولے صاحب کی تاکید پر مجھ سے آکر ملے۔پہلی بار 18 فروری 1986ء کو اور دوسری بار آج 30 مارچ 1986ء کو۔پہلی بار جب وہ دہلی آئے تھے تو ان کے ساتھ ایک اور صاحب تھے جن کا نام انہوں نے مسٹر سالوی بتایا تھا۔اس سے واضح نہ تھا کہ وہ ہندو

ہیں یا مسلمان۔ تاہم اپنے عام معمول کے مطابق میں نے ہندو اور مسلمان کی کوئی بات نہ کی بلکہ عام سچائی کی بات کی۔ مسٹر مشتاق انتولے نے بتایا کہ اس سے مسٹر سالوی بہت متاثر ہوئے۔ یہاں سے واپس جانے کے بعد وہ بمبئی میں برابر میرا تذکرہ کرتے رہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے بہت سی مذہبی شخصیتیں دیکھی ہیں، مگر اس قسم کی شخصیت میں نے پہلی بار دیکھی۔ مسٹر سالوی کو اس بات پر سخت تعجب تھا کہ میں نے ملاقات میں کسی قسم کی فرقہ وارانہ بات نہیں کی۔ ان کے نزدیک کوئی مہان روح ہی ایسا کر سکتی ہے کہ ''ہندو مسلم'' سے اوپر اٹھ کر سوچے اور اس سے اوپر اٹھ کر بات کرے۔

میں نے مسٹر مشتاق انتولے سے کہا کہ میرا دل خدا کے فضل سے اس قسم کے بھید بھاؤ سے بالکل خالی ہے۔ میں ہندو اور مسلم کی اصطلاحوں میں نہیں سوچتا بلکہ حق اور ناحق کی اصطلاح میں سوچتا ہوں۔ حق اور ناحق دو قوموں کے نام نہیں، بلکہ یہ دو الگ الگ اصول ہیں۔ میں نے کہا کہ میں اپنی پرائیوٹ مجلسوں میں یا گھر کے اندر بھی ہندوؤں کی برائی نہیں کرتا، جو کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا عام طریقہ بن چکا ہے۔

ہندو اور مسلم کی اصطلاحوں میں سوچنا قومی اصطلاحوں میں سوچنا ہے۔ اسلامی طریقہ یہ ہے کہ حق اور ناحق کی اصطلاح میں سوچا جائے۔

31 مارچ 1986

ریاست عمان (Oman) کی ایک تیرہ سالہ شادی شدہ لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ لندن گئی تو وہاں اس کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اسلامی شریعت کے مطابق اگرچہ ایسا نکاح غلط نہیں، مگر مغرب کے لوگ کم سنی کے نکاح کو پسماندگی کی علامت اور ایک جاہلانہ رواج سمجھتے ہیں۔ چنانچہ لڑکی کا انگلینڈ میں رہنا مشکل ہو گیا۔ یہاں تک کہ حکومت عمان کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ انگلینڈ کی سماجی نفسیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس لڑکی کو واپس بلا لیا جائے۔

ہندی اخبار نو بھارت ٹائمز نے اس خبر پر اپنے ادارتی کالم میں تبصرہ کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ انگلینڈ کے لوگ کم سنی کے نکاح کو برا سمجھتے ہیں، مگر کم سنی کے جنسی تعلقات کو وہ اس سے زیادہ بڑے پیمانے پر اپنے یہاں اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ پچھلے کئی مہینوں سے ایک

مقدمہ انگلینڈ کی عدالت میں اس سوال پر چل رہا ہے کہ کیا ڈاکٹروں کو یہ اختیار ہے کہ وہ والدین کی اجازت کے بغیر ان نابالغ لڑکیوں کو مانع حمل کی گولیاں دیں۔ایک بے حد پریشان ماں نے عدالت کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے یہ فریاد کی تھی کہ اپنے بچوں کے چال چلن کی نگرانی کرنا کم ازکم اس وقت تک میری ذمہ داری ہے جب تک وہ نابالغ ہیں۔لیکن اس غم زدہ ماں کی فریاد کو رد کرتے ہوئے عدالت نے فیصلہ دیا کہ 13 سال کی نابالغ لڑکی ڈاکٹر سے مانع حمل کی گولی لے کر اپنے نوجوان آشنا کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرسکتی ہے۔

نوبھارت ٹائمز کے ایڈیٹر نے مذکورہ دونوں واقعات کی تفصیل دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اب یہ بتائیے کہ کم سنی کی شادی زیادہ بہتر ہے یا کم سنی کی آوارگی؟

جدید مغربی تہذیب کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ وہ ''آزادی'' کے نام پر لامحدود جنسی تعلق کی اجازت دیتی ہے،مگر قید نکاح کے ساتھ محدود ازدواجی تعلق بھی اس کو گوارا نہیں۔

1اپریل1986

یہ 15 ستمبر 1975 کا واقعہ ہے۔روزنامہ الجمعیۃ میں ایک صاحب بطور کلرک کام کرتے تھے،جن کا نام عزیز احمد تھا۔وہ نگینہ (ضلع بجنور، یوپی) کے رہنے والے تھے۔انہوں نے 15 ستمبر کو مجھ سے کہا کہ میری گھڑی گم ہوگئی ہے۔اچانک میری زبان سے نکلا''ان شاء اللہ،آپ کی گھڑی مل جائے گی''۔وہ میری بات سن کر ہنس دیے۔انہوں نے کہا مجھے تو یہ بات بالکل ناممکن نظر آتی ہے۔

دو دن بعد انہوں نے بتایا کہ محلہ کا ایک لڑکا ان کی گھڑی لا کر اسلم صاحب کو دے گیا اور کہا کہ یہ مجھے پڑی ہوئی ملی ہے۔انہوں نے بتایا کہ مذکورہ لڑکا کبھی کبھی اسلم صاحب کے گھر پر آتا ہے۔ عزیز صاحب اپنی گھڑی کو کمرہ میں رکھ کر نہانے کے لیے چلے گئے تھے۔واپس آئے تو گھڑی نہیں تھی۔ وہ لڑکا اتفاق سے عین اسی وقت گھر میں آیا اور عزیز صاحب نے اس کو نکلتے ہوئے دیکھا۔جب عزیز صاحب کو معلوم ہوا کہ گھڑی گم ہے تو انہوں نے مذکورہ لڑکے سے گھڑی کی بابت دریافت کیا تو اس نے کہا کہ میں گھڑی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔دو دن بعد اس لڑکے نے گھڑی لا کر دے دی۔

میں نے جو بات کہی وہ کسی علم غیب کی بنا پر نہیں کہی تھی۔بلکہ صرف عزیز صاحب کی پریشانی

کو گھٹانے کے لیے کہی تھی۔ مگر یہ ایک ہونے والی بات تھی کہ گھڑی دوبارہ انہیں مل گئی۔

بزرگوں کے بارے میں بہت سے اس قسم کے واقعات جو مشہور ہیں ان کی حقیقت بس یہی ہے۔ ایسے واقعات کسی کی کرامت کی وجہ سے نہیں ہوتے، وہ اسی لیے ہوتے ہیں کہ وہ ہونے والے ہی تھے۔ چنانچہ ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کی باتیں کبھی صحیح نکلتی ہیں اور کبھی غلط۔ مگر معتقدین صرف صحیح ہونے والی باتوں کو لیتے ہیں اور اس کو مزید افسانوی بنا کر مشہور کر دیتے ہیں۔ بزرگوں کی کرامت کی حقیقت بس اتنی ہی ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

2 اپریل 1986

غالباً 1941 کی بات ہے۔ اس وقت میں مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر، اعظم گڑھ، یوپی) میں پڑھتا تھا۔ مدرسہ کے ریڈنگ روم (دار المعلومات) میں جو عربی پرچے آتے تھے، ان میں قاہرہ کا ایک ماہنامہ تھا، جس کا نام ''المقتطف'' تھا۔

میرا سالانہ امتحان کا زمانہ تھا۔ میں دار المعلومات میں حسب معمول گیا۔ وہاں تازہ المقتطف آیا ہوا تھا۔ اس کو دیکھتے ہوئے میں ایک صفحہ پر پہنچا۔ اس صفحہ پر ایک خاص تدبیر درج تھی، جو قسمت معلوم کرنے سے متعلق تھی۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ آدمی حسب ذیل جملے کو اپنی زبان سے چند بار دہراتا— اَبرا کا دا بیسَن کا تَن۔

اس کے بعد وہ ایک خاص عمل کرتا، جس کے نتیجہ میں رسالہ کے مطبوعہ جوابات میں سے کوئی ایک اس کے سامنے آجاتا تھا۔ میں نے اپنے سالانہ امتحان کے بارے میں مقررہ عمل کیا۔ اس کے بعد جو جواب آیا وہ اس کے الفاظ میں یہ تھا: ستنجح نجاحاً کبیراً (تم عنقریب ایک بڑی کامیابی حاصل کروگے)۔

اس کے بعد سالانہ امتحان ہوا۔ میرے درجہ میں غالباً بیس سے زیادہ طلبہ تھے۔ میں سب کے مقابلہ میں اول نمبر سے پاس ہوا۔

ایک توہم پرست آدمی یہ سمجھ لے گا کہ یہ چند ناقابل فہم الفاظ (ابرا کا دابیسن کا تن) کا کرشمہ تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ محض ایک اتفاقی مطابقت تھی، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

3اپریل1986

میرے نانا خدا بخش مرحوم پرانے قسم کے زمیندار تھے۔ میں نے ان کو نہیں دیکھا۔ البتہ والدہ کے ذریعے ان کے بعض قصے سنے ہیں۔

نانا کا ایک قصہ جو والدہ نے بتایا تھا وہ یہ تھا کہ ایک مرتبہ نانا اور ایک شخص کے درمیان جائداد کا مقدمہ تھا۔ مقدمہ چل رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ تاریخ آ گئی جس دن نانا کا خصوصی بیان عدالت میں ہونا تھا۔ اس روز نانا کی حاضری عدالت میں ضروری تھی۔ فریق ثانی نے سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت عین اسی دن صبح سویرے ان کے گھر میں آگ لگا دی، تاکہ وہ گھر کی آگ بجھانے میں مصروف ہو جائیں اور عدالت نہ پہنچ سکیں، جو ان کی بستی سے دور ضلع کے صدر مقام (اعظم گڑھ) میں واقع تھی۔

نانا صبح کو اٹھے تو گھر میں آگ لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے فوراً معاملہ کو سمجھ لیا۔ انہوں نے فریق ثانی کا نام لے کر کہا کہ یہ یقیناً اسی شخص کا کام ہے۔ اس نے یہ آگ اس لیے لگائی ہے کہ میں اس کو بجھانے میں لگ جاؤں اور عدالت میں نہ پہنچ سکوں اور میرا مقدمہ خراب ہو جائے۔ مگر میں اس کے باوجود عدالت میں جاؤں گا۔ چنانچہ وہ اس حال میں بستی سے روانہ ہوئے کہ ان کے پیچھے ان کا گھر جل رہا تھا اور وہ ریلوے اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔

میرا حال بھی آج کل کچھ ایسا ہی ہے۔ شیطان نے کچھ لوگوں کو ورغلا کر میرے خلاف ایسی کارروائیاں کرائی ہیں، جس نے میرے ذہن کو آخری حد تک ڈسٹرب کر دیا ہے، تاکہ میں خدا کے دین کا جو کام کر رہا ہوں وہ نہ کر سکوں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ میرا معاملہ بھی خدا بخش نانا کا معاملہ ثابت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ مجھے ہمت دے گا کہ میں اپنے گھر کو جلتا ہوا چھوڑ کر دین کی طرف بڑھوں اور خدا کے پیغام کی پیغام رسانی کا کام جاری رکھوں۔ ''تذکیر القرآن'' کی تحریر اب آخری مرحلے میں ہے۔ اسی طرح، ان شاء اللہ، سیرت کی کتاب بھی مکمل ہو کر رہے گی۔

4اپریل1986

آج کے ہندوستان ٹائمس (4اپریل1986) میں ایک ہندو کا مفصل مضمون اخبار کے صفحہ 9 پر شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے:

(ہندوستانی مسلمان چوراہے پر)۔اس مضمون میں دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے 1947ء سے پہلے اپنی علیحدہ قومیت قائم کرنے میں اپنے مسائل کا حل دریافت کیا تھا۔ مگر پاکستان کے قیام کے باوجود ان کے مسائل حل نہیں ہوئے۔تاہم ابھی تک اپنے سابقہ خول میں پڑے ہوئے ہیں۔

مضمون نگار نے نہایت ہمدردانہ طور پر مسلمانوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ ایک اور قسم کے علیحدہ تشخص (separate identity) میں اپنے مستقبل کو تلاش کریں۔ اور وہ ہے تخلیقیت (creativity)۔مسلمان اس ملک میں ایک تخلیقی اقلیت کا کردار ادا کریں۔اس نے مزید کہا کہ تاریخ بتاتی ہے کہ بہت سی تخلیقی اقلیتیں کسی ملک اور قوم کو نئی زندگی دینے کا واقعہ ثابت ہوئی ہیں۔

مضمون نگار نے کہا کہ میں اسلام کی اعلیٰ تعلیمات اور اس کے فلسفۂ مساوات سے متاثر ہوں۔اسلام کی تعلیمات میں اتنی جان ہے کہ مسلمان اس کے بل پر تخلیقی اقلیت بن کر اس ملک میں ابھر سکتے ہیں۔

یہ بلاشبہ ایک نہایت درست بات ہے۔دوسرے بہت سے ہندو بھی اس قسم کی بات کرتے رہے ہیں۔مگر مسلمان اب تک اس طرز فکر کو اپنا نہ سکے۔اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے جھوٹے قومی مسائل میں اتنا زیادہ الجھے ہوئے ہیں کہ وہ اسلام کی تعلیمات کے تخلیقی امکانات کو نہ محسوس کر پاتے اور نہ ان کے اندر یہ جذبہ ابھرتا ہے کہ وہ ان امکانات کو استعمال کر کے آگے بڑھیں۔

مذکورہ مضمون نگار مسٹر گھوش ہیں۔

15اپریل1986

آج دکتور عبدالمحسن الترکی (جامعۃ الامام، ریاض) اور دوسرے کئی سعودی اہل علم کا وفد ہمارے مرکز میں آیا۔مرکز کو دیکھ کر وہ بار بار ''جمیل جمیل'' کہتے رہے۔مرکز کی خوبصورت عمارت، اس کی صفائی اور ترتیب ہر چیز ان کو دوسرے اسلامی اداروں کے مقابلہ میں نمایاں طور پر بہتر نظر آئی۔یہاں کی چھپی ہوئی کتابیں اور الرسالہ کو دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوئے۔

دکتور ترکی نے تعجب خیز لہجہ میں پوچھا کہ اس کام میں آپ کی مدد کون کرتا ہے۔ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا: ”الَّذِيْ عِنْدَهٗ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض“ (وہی ذات جس کے پاس آسمان وزمین کے خزانے ہیں)۔

وہ مسکرا کر چپ ہو گئے۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ ہمارے مرکز سے اس وقت جو کام ہو رہا ہے، وہ ساری مسلم دنیا میں کسی بھی ادارہ سے نہیں ہو رہا ہے۔ اس لیے لوگ تعجب کے ساتھ پوچھتے ہیں کہ کس کے تعاون سے یہ کام ہو رہا ہے۔ میں پوری سنجیدگی کے ساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ یہ کام براہ راست خدا کی طرف سے ہو رہا ہے۔

دکتور ترکی کی قیادت میں جو سعودی وفد آیا ہے، اس کا دوسرے اسلامی ادارے زبردست استقبال کر رہے ہیں۔ ہندوستان کے ایک اسلامی ادارہ کے ذمہ داران کے ساتھ ہمارے یہاں بھی آئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ ان سے بات کرتے ہوئے بار بار اس قسم کے جملے بولتے ہیں:

اکرمکم اللّٰہ، اللّٰہ یبارك فیکم

مگر مجھے اس قسم کی بات کرنا بالکل نہیں آتا۔ اس کے باوجود دوسروں سے کہیں زیادہ اعلیٰ معیار پر ہمارا کام ہو رہا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد ہے۔ ورنہ میرے اندر مطلق کوئی صلاحیت نہیں۔

16 اپریل 1986

آج کے ٹائمس آف انڈیا (16 اپریل 1986) صفحہ 8 پر ایک خبر کی سرخی یہ ہے:

Manusmruti, Shariat Reactionary

(منوسمرتی اور شریعت دونوں رجعت پسند)۔ یہ مسٹر ایس ایم جوشی کے ایک انٹرویو کا خلاصہ ہے۔ وہ 82 سالہ فریڈم فائٹر ہیں اور سوشلسٹ ذہن رکھتے ہیں۔ آج کل وہ پونا میں مقیم ہیں۔ انٹرویور نے ان کی بابت یہ الفاظ لکھے ہیں:

Mr. S. M. Joshi said that the Shariat of the Muslims and the Manusmurti of the Hindus followed by both the communities for centuries were equally and socially reactionary.

مسٹر جوشی نے کہا کہ مسلمانوں کی شریعت اور ہندوؤں کی منوسمرتی جن کی پیروی دونوں فرقے صدیوں سے کر رہے ہیں، وہ مساوی طور پر اور سماجی طور پر رجعت پسند ہیں۔ اخبار کی رپورٹ میں مسٹر جوشی کا صرف اتنا ہی ریمارک نقل کیا گیا ہے۔ مزید تفصیل درج نہیں۔

شریعت کو منوسمرتی کے ساتھ بریکٹ کرنا بلا شبہ غلط ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ منوسمرتی میں واضح طور پر ایسی تعلیمات ہیں جو انسانی برابری کے تصور کے خلاف ہیں۔ جب کہ اسلام میں یقینی طور پر ایسی کوئی تعلیم نہیں۔ اس کے باوجود مسٹر جوشی نے دونوں کو کیوں بریکٹ کیا۔ اس کی نفسیاتی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ اسلامی شریعت کو منوسمرتی کے ساتھ بریکٹ کر کے اپنے احساس کمتری کو ہلکا کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ان کے اس ریمارک کا مطلب یہ ہے کہ — اگر منوسمرتی میں رجعت پسندانہ باتیں ہیں تو اس سے کیا ہوا۔ اس قسم کی رجعت پسندانہ باتیں دوسرے مذاہب میں بھی موجود ہیں۔

7 اپریل 1986

محمد رضا خاں آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی کے عربک یونٹ میں ٹرانسلیٹر ہیں۔ انہوں نے ندوہ سے فراغت کی۔ اس کے بعد عربی لٹریچر میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا۔ وہ آل انڈیا ریڈیو ہاسٹل (کرزن روڈ) میں ایک سرکاری کوارٹر میں رہتے ہیں۔

اگست 1984ء میں وہ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے اپنے وطن چلے گئے۔ مگر انہوں نے اس کے لیے کوئی چھٹی نہیں لی اور نہ بعد کو کوئی درخواست بھیجی۔ عرصہ کے بعد وہ واپس آئے اور وہ اپنے آفس گئے تو دوبارہ انہیں کام نہیں ملا۔ اور سکیورٹی آفیسر نے ان کا آئیڈنٹٹی کارڈ بھی لے لیا۔ ان کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ کسی قدر دماغی اختلال میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے انہیں ہدایت دی گئی کہ وہ سرکاری ڈاکٹر سے اپنا چیک اپ کرائیں۔ انہوں نے یہ بھی نہیں کیا۔

اس طرح وہ ڈیڑھ سال سے بے کار پڑے ہوئے تھے اور حسب قاعدہ طرح طرح کے مسائل پیش آ رہے تھے۔ آج مجھے ان کی بیوی کا خط ملا جس میں انہوں نے اپنی اور اپنے بچوں کی پریشانی کا ذکر کیا تھا۔ چنانچہ میں آج صبح آل انڈیا ریڈیو ہاسٹل گیا اور محمد رضا خاں صاحب کو لے کر آل انڈیا ریڈیو پہنچا۔ وہاں اکسٹرنل سروسز ڈویزن کے ڈائریکٹر مسٹر راماسوامی (C. R. Ramaswamy) سے

ملاقات کی۔ وہ نہایت خوش دلی کے ساتھ ملے۔ انہوں نے کوئی شکایت نہیں کی اور فوراً ہی ہم کو ڈپٹی ڈائریکٹر مسز رگمینی (Rugmini) کے پاس بھیجا۔ مسز رگمینی نے بھی کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں کی اور فوراً ایک سپروائزر کے نام لکھ کر دیا جس میں ہدایت تھی کہ محمد رضا خاں صاحب کو آج سے ڈیوٹی پر لگا لیا جائے۔ میں نے ڈپٹی ڈائریکٹر صاحبہ سے کہا کہ ڈیڑھ سال کی تنخواہ کا کیا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس کا بھی انتظام کریں گے۔

یہ سلوک ایک مسلمان کے ساتھ ایک ایسے ملک میں ہوا جس کو ''ہندو ملک'' کہا جاتا ہے۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو صرف شکایت کرنا جانتے ہیں۔ ان کی زبان کبھی اعتراف کے لیے نہیں کھلتی۔

18 اپریل 1986

ہمارے مشن کے مخالفین کی مخالفت آج کل زوروں پر ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ لوگوں کی مخالفت میں جتنا اضافہ ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ کی مدد میں بھی اسی کے ساتھ اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

ہندوستان کے نیم انگریزی داں یہ پروپیگنڈا کرنے میں مشغول ہیں کہ الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن غیر معیاری ہے۔ اس کی زبان غلط ہوتی ہے۔ اگرچہ ان حضرات کا حال یہ ہے کہ جب ان سے پوچھا جائے کہ الرسالہ (انگریزی) میں زبان کی غلطی کی کوئی مثال بتائیے تو وہ مثال بھی نہیں دے پاتے۔

مگر عین اسی وقت الرسالہ (انگریزی) باہر کی دنیا میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کرتا جا رہا ہے۔ افریقہ (نائجیریا) میں مقیم ایک صاحب (خواجہ کلیم الدین، مقیم حال پنسلوانیا، امریکا) چند مہینے سے ہم سے خط و کتابت کر رہے تھے۔ وہ الرسالہ (انگریزی) کا افریقی ایڈیشن نکالنا چاہتے ہیں۔ اب انہوں نے بالفعل یہ کام شروع کر دیا ہے۔ ڈاک سے ہم کو الرسالہ انگریزی کا مارچ 1986ء شمارہ موصول ہوا ہے۔ یہ الرسالہ (انگریزی) کے افریقی ایڈیشن کا پہلا شمارہ ہے۔ اسی طرح اب وہ، ان شاء اللہ، ہر مہینہ نکلتا رہے گا۔ پتہ یہ ہے:

Uniprinter Limited, p.o. box no.2779, Kano, Nigeria

نائجیریا میں الرسالہ کو پسند کرنے والوں کا ایک باقاعدہ حلقہ بن گیا ہے۔ اور وہی اس ایڈیشن کو شائع کر رہا ہے۔ افریقہ کے مختلف ملکوں میں اس سے پہلے بھی بڑی تعداد میں الرسالہ جاتا رہا

ہے۔اب اس میں یہ مزید ترقی ہوئی ہے کہ خود افریقہ میں اس کو reprint کیا جارہا ہے۔اسی طرح ان شاء اللہ اسلامی مرکز کا پیغام بہت وسیع پیمانے پر پھیلنا ممکن ہو سکے گا۔

یہ تمام تر اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ورنہ الرسالہ میں اس قسم کی کوئی کشش نہیں جو کسی چیز کو عوامی مقبولیت عطا کرتی ہے۔

9 اپریل 1986

پاکستان کے انگریزی اخبار اسٹار (The Star) میں ایک مضمون بابری مسجد (اجودھیا) کے بارے میں چھپا تھا۔اس کو نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (8 اپریل 1986) نے دوبارہ شائع کیا ہے۔

ایک پاکستانی مسلمان نے پاکستانی مسلمانوں کی حالت پر دردمندانہ تبصرہ کیا ہے۔اس نے لکھا ہے کہ بابری مسجد کے مسئلہ پر پاکستانی اخباروں نے سنسنی خیز سرخیاں قائم کیں۔علماء نے پرشور تقریریں کیں۔نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں جوش پیدا ہو گیا۔انہوں نے جیکب آباد میں ہندوؤں کے خلاف بدلے کی کارروائی شروع کردی۔

اس نے لکھا ہے کہ اسلام اس زمانے میں نام بن گیا ہے اس کا کہ اسلام کے نام پر کفر کے فتوے دیے جائیں۔اسلام دشمنوں کو جلایا پھونکا جائے۔لوگوں کو کوڑے مارے جائیں۔ایک دوسرے کے خلاف لامتناہی لڑائی جاری رکھی جائے۔مضمون نگار نے اپنا مضمون ان الفاظ پر ختم کیا ہے:

Islam was mankind's greatest liberator. It has been converted into an inquisition. p.8

اسلام انسانیت کو آزادی عطا کرنے والا مذہب تھا۔مگر آج وہ ایک احتسابی عدالت میں تبدیل کردیا گیا ہے۔

آج اسلام کو سیاست اور لیڈری کا عنوان بنادیا گیا ہے۔اس کا سب سے بڑا نقصان خود اسلام کو پہنچا ہے۔لوگوں کو آج اسلام سے نفرت ہوگئی ہے غیر مسلموں کو بھی اور مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کو بھی۔اسلام کے یہ نمائندے اگر مخلص نہیں تو بلاشبہ وہ نادان ہیں اور اگر انہیں نادان نہ مانا جائے تو ان کا مخلص ہونا یقینی طور پر مشتبہ ہوجاتا ہے۔

10اپریل1986

دکتور عبدالحلیم عویس ریاض کی جامعۃ الامام میں علوم اجتماعی کے پروفیسر ہیں۔ چند دن وہ ہوٹل میں مقیم تھے۔ آج وہ ہمارے یہاں آئے ہیں۔ دو دن ہمارے مرکز میں رہ کر اتوار کو واپس ریاض جائیں گے۔ (2011ء میں دکتور عبدالحلیم عویس کا انتقال ہو چکا ہے)

وہ نہایت ذہین اور خوش طبع آدمی ہیں۔ میں نے کمرہ کی الماری کھول کر کہا کہ یہاں ہینگر ہے۔ اس میں آپ اپنے کپڑے لٹکا سکتے ہیں۔ انہوں نے ہینگر (شماعہ) پر ایک عربی مثل سنائی:

نحن نعلّق علیٰ شماعۃ الاستعمار کل اخطائنا

یعنی ہم اپنی تمام غلطیوں کو استعمار (colonialism) کے ہینگر پر لٹکاتے ہیں۔ اس عربی مثل میں جو بات کہی گئی ہے، وہ بلا شبہ صد فیصد درست ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہمارے مسائل زیادہ تر اسی غلط ذہن کا نتیجہ ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنی غلطیوں اور ناکامیوں کا ذمہ دار دوسروں کو قرار دیتے ہیں۔ یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ جس نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو ناکام بنا دیا ہے۔ یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں لازماً یہ ہونا ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کو ڈھکیل کر آگے بڑھ جائے۔ ایک قوم دوسری قوم کی شکست پر اپنی فتح کا قلعہ تعمیر کرے۔ یہی تاریخ میں ہمیشہ ہوا ہے اور آئندہ بھی ہمیشہ یہی ہوتا رہے گا— ہم دنیا کے اس نظام کو بدل نہیں سکتے۔ ہم صرف یہ کر سکتے ہیں کہ اس نظام کو بطور واقعہ مان کر اپنی منصوبہ بندی کریں۔

11اپریل1986

چارلس شوبھراج (پیدائش 1944ء) ایک بین الاقوامی مجرم ہے۔ وہ دہلی کے تہاڑ جیل سے مارچ 1986ء میں فرار ہو گیا۔ اس کی منصوبہ بندی نہایت مکمل تھی۔ مگر 7اپریل 1986ء کو بمبئی پولس نے اس کو پکڑ لیا۔

چارلس شوبھراج اپنے ساتھیوں کا بہت وفادار تھا۔ وہ تہاڑ جیل سے بھاگا تو اپنے ساتھیوں کو بھی ساتھ لے گیا۔ ان میں سے ایک ساتھی اتفاق سے پکڑا گیا۔ اسی ساتھی کے ذریعہ ابتدائی سراغ ملا

جو بالآخر شوبھراج کی گرفتاری تک پہنچا۔ رپورٹ کا ایک حصہ یہ ہے:

Police sources said Tyagi cracked when they told him they had caught Sobhraj. He burst out saying, I told that fool not to come to Bombay.

پولس کے ذرائع نے بتایا کہ (شوبھراج کا ساتھی) تیاگی اس وقت کھل گیا جب انہوں نے اس سے کہا کہ انہوں نے شوبھراج کو پکڑ لیا ہے۔ یہ سن کر وہ پھٹ پڑا اور اس نے کہا کہ میں نے اس بیوقوف سے کہا تھا کہ وہ بمبئی نہ آئے۔

چارلس شوبھراج کے ساتھی کو بلف (bluff) دے کر اس طرح پولس نے معلوم کر لیا کہ شوبھراج بمبئی یا اس کے آس پاس ہے۔ اس کے بعد اس علاقے میں کھوج شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ وہ ایک ہوٹل میں پکڑ لیا گیا۔

آدمی کتنا ہی زیادہ تیاری کرے، کوئی نہ کوئی گوشہ ایسا رہ ہی جاتا ہے جہاں اس کی تیاری نامکمل ہو۔ اور اسی گوشہ سے طوفان اس کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں وہی محفوظ ہے جس کو خدا محفوظ رکھے۔ انسان اپنے آپ کو بچانے کی طاقت نہیں رکھتا۔

12 اپریل 1986

آج ڈاکٹر عبدالرشید صاحب (حیدرآباد) اور ان کے ایک ساتھی ملنے کے لیے آئے۔ ڈاکٹر صاحب ریاض (سعودی عرب) میں ڈاکٹر تھے۔ وہ وہاں سے چھوڑ کر ہندوستان آئے ہیں اور حیدرآباد میں اسلامی مرکز کے مشن کے ساتھ جڑ کر کام کرنا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرشید صاحب کا ذہن خالص آخرت پسندانہ ہے۔ وہ اس راز کو جان گئے ہیں کہ اصل کام افراد کے اندر اللہ سے تعلق اور آخرت کا فکر پیدا کرنا ہے۔ اگر یہ چیز آجائے تو بقیہ چیزیں اپنے آپ آجائیں گی۔

ایک بار ایک عرب صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ آپ کی سب سے اونچی کتاب ''مذہب اور جدید چیلنج'' ہے۔ بقیہ کتابیں اس کے نیچے ہیں۔ جو لوگ اس طرح کی باتیں کہتے ہیں وہ ہمارے مشن کو صرف 50 فیصد سمجھ سکے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرشید صاحب خدا کے فضل سے ان میں نہیں ہیں۔ انہوں نے اس مشن کو پوری طرح سمجھا ہے۔

لوگ مظاہر کو دیکھتے ہیں اور ان پر محنت کرنے کو کام سمجھ لیتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے درخت کی شاخ سوکھی ہوئی نظر آئے تو آدمی اسی شاخ پر پانی ڈالنا شروع کردے۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ شاخوں کو ہرا بھرا کرنے کا راز یہ ہے کہ درخت کی جڑ میں پانی دیا جائے۔ مگر انسانی زندگی کے معاملہ میں لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ شاخوں پر پانی ڈالو اور درخت ہرا بھرا ہو جائے گا۔

13 اپریل 1986

ایک عرب عالم جو جامعۃ الامام (ریاض) میں پروفیسر ہیں۔ اسلامی مرکز میں آئے۔ وہ ہمارے مشن سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ مجھے آپ کے اس نقطۂ نظر سے اتفاق ہے کہ اسلام کو سیاسی ٹکراؤ اور قومی مطالبات کا اشو نہ بنایا جائے۔ بلکہ اس کو ایک دعوتی قوت کی حیثیت سے اٹھایا جائے۔ اور اس کو عصری اسلوب میں مدلل کرکے لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔

موصوف کی پرزور تجویز ہے کہ اسلامی مرکز سے الرسالہ کا عربی ایڈیشن جاری کیا جائے، تاکہ عالم عربی اسلامی مرکز کے افکار سے واقف ہو سکے۔

دوران گفتگو میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں ہر آدمی ''دعوت'' کا لفظ بولتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی کرتا ہے کہ وہ دوسری قوموں سے مسلمانوں کے قومی مطالبات اور مادی نزاعات کی بھی وکالت کر رہا ہے۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسری کی ضد ہیں۔

مسلمانوں کو داعی گروہ کی حیثیت سے اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے قومی جھگڑوں کو یک طرفہ طور پر ختم کریں، تاکہ ان کے بعد دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم ہو۔ دوسری قوموں کو مادی حریف اور سیاسی رقیب بنانے کے بعد ان کے اوپر دعوت کا کام نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی دعوت مسلمانوں کے اپنے ذہن میں وجود میں آسکتی ہے، وہ خارجی دنیا میں وجود میں نہیں آسکتی۔

14 اپریل 1986

پاکستان میں سیاسی پابندیوں کے زمانہ میں مس بے نظیر بھٹو لندن چلی گئی تھی۔ اب پاکستان میں

سیاسی پارٹیوں کو آزادی دی گئی ہے تو بے نظیر بھٹو دوبارہ پاکستان آ گئی۔ اپریل 1986 میں بے نظیر بھٹو لاہور کے ہوائی اڈہ پر اتری تو لاکھوں انسان استقبال کے لیے موجود تھے۔ ہندوستان کے چند آدمی جو ان دنوں لاہور میں تھے، انہوں نے واپس آ کر مجھے دہلی میں بتایا کہ ہم بے نظیر بھٹو کے اجتماع میں تو شریک نہیں ہوئے، تاہم سڑکوں پر بے نظیر بھٹو کے حامیوں کا اتنا ہجوم تھا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لاہور عملاً پیپلز پارٹی کے قبضے میں ہے۔ ٹائمس آف انڈیا (14 اپریل 1986ء) کی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان کے صدر جنرل ضیاء الحق نے اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

The politics of processions and public meetings had generated more heat than light.

جلسوں اور جلوسوں کی سیاست نے گرمی زیادہ پیدا کی ہے اور روشنی کم۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہ بے نظیر بھٹو (وفات 2007) کی سیاست جنرل ضیاء الحق کے نزدیک counter productive ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا خود جنرل ضیاء الحق (وفات 1988) کی سیاست بھی کاؤنٹر پروڈکٹیو نہیں۔

جنرل ضیاء الحق صاحب نے اسلام کے نام پر جولائی 1977ء میں پاکستان کی حکومت پر قبضہ کیا۔ وہ ہر قسم کے اقتدار اور وسائل پر پوری طرح قابض ہو کر پاکستان میں اسلامائزیشن کی تحریک چلا رہے ہیں۔ وہ مسلسل یہ اعلان کرتے رہے ہیں کہ ان کا اسلامائزیشن کا عمل پوری طرح کامیاب ہے۔ وہ اپنے آپ کو اسلام کا نمائندہ بتاتے ہیں اور بھٹو پارٹی کو غیر اسلام کا نمائندہ۔

اب سوال یہ ہے کہ جب جنرل ضیاء الحق صاحب نے تمام پاکستانیوں کو اسلامی بنا رکھا ہے تو یہ کیسے ممکن ہوا کہ یہ پاکستانی لوگ غیر اسلامی لیڈرشپ کے پیچھے دوڑ پڑیں۔ کیا جنرل ضیاء الحق صاحب کی سیاست بھی عین اسی طرح کاونٹر پروڈکٹیو ہے جس کا الزام وہ بھٹو پارٹی کو دے رہے ہیں۔

15 اپریل 1986

جناب مہتاب سنگھ صاحب ملنے کے لیے آئے۔ وہ سائنس وٹکنالوجی میں سینئر آفیسر رہے ہیں اور بیرونی ملکوں کا بھی دورہ کیا ہے۔

میں نے اردو الرسالہ انہیں دکھاتے ہوئے پوچھا کہ کیا آپ اردو پڑھتے ہیں۔ انہوں نے

کہا کہ ہاں، اردو تو ہماری اصل زبان ہے۔ ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو تقسیم کے بعد پاکستان سے آئے۔ وہاں ہم نے اردو اور فارسی پڑھی۔ ہمارے ابتدائی استاد ایک مولوی صاحب تھے، جن سے ہم مسجد میں جا کر پڑھا کرتے تھے۔

اس طرح کی اور کئی باتیں انہوں نے بتائیں۔ میں نے سوچا کہ وہ مسلم قائدین بھی کتنے نادان تھے، جنہوں نے جھوٹے مذہبی جھگڑے کھڑے کر کے ملک کو تقسیم کرایا اور ایک پوری قوم جو اردو زبان اور مسلم تہذیب کو اپنائے ہوئے تھی اس کو زبردستی دھکیل کر اپنے سے دور کر دیا۔

مسلمانوں نے موجودہ زمانے میں جو سب سے بڑی چیز کھوئی ہے وہ دعوتی ذہن ہے اور اس قسم کی تمام نادانیاں اسی کا نتیجہ ہیں۔

مہتاب سنگھ صاحب نے دوران گفتگو کہا کہ میں نے انگریزی کی ایک ڈکشنری میں لفظ silly دیکھا تو اس کا ایک مطلب مذہبی آدمی لکھا ہوا تھا۔ میں نے اسی وقت ویبسٹر کی بڑی ڈکشنری نکالی اور اس میں سلی کا لفظ دیکھا۔ ڈکشنری میں اس لفظ کے چھ معنی لکھے ہوئے تھے، مگر اس میں مذہبی شخص شامل نہ تھا۔

میں نے جناب سنگھ سے کہا کہ کسی لفظ کا ایک لغوی مفہوم ہوتا ہے اور ایک مجازی مفہوم۔ لفظ سلی کا لغوی مفہوم تو بے وقوف اور سادہ لوح ہے۔ مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مذہب میں زیادہ پرجوش طور پر وہی لوگ جاتے ہیں جو سیدھے سادے کم سمجھ ہیں۔ زیادہ ہوشیار لوگ مذہب کی طرف کم رجوع کرتے ہیں۔ اس عملی صورت حال کی وجہ سے سلی کا لفظ شاید مجازی طور پر مذہبی لوگوں کے لیے بھی کسی علاقہ میں بولا جانے لگا ہو۔

ہندوستان میں جو لوگ موجودہ زمانہ میں مذہبی سیاست چلاتے رہے ہیں ان پر تو یہ یقیناً پوری طرح صادق آتا ہے۔

اس دنیا میں فیض بقدر استعداد کا اصول ہے۔ یعنی جتنا بونا اتنا ہی پانا، نہ اس سے کم، نہ اس سے زیادہ۔

ماڈرن ایج میں سیرت نبوی کا ریلیونس

(سی پی ایس انٹرنیشنل کی چیئر پرسن ڈاکٹر فریدہ خانم نے لاہور کالج فار وومن یونیورسٹی کے اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ فیکلٹی کے زیر اہتمام پہلے یک روزہ انٹرنیشنل سیرت کانفرنس، 10 اکتوبر 2023، کے لیے زیرِنظر مضمون کا ایک حصہ ریکارڈ کروایا تھا۔ افادہ عام کے لیے اس کو مکمل شائع کیا جارہا ہے)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتہائی خوشی کی بات ہے کہ مجھے اس کانفرنس میں شرکت کا موقع مل رہا ہے۔ اس کے لیے میں وائس چانسلر ڈاکٹر شگفتہ ناز، ڈین آف فیکلٹی پروفیسر فلیحہ کاظمی اور دوسرے آرگنائزر کی شکر گزار ہوں۔ اس خاص موقع پر میں یہاں چند باتیں عرض کرنا چاہتی ہوں۔

قرآن میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لیے زندگی گزارنے کا ایک بہترین نمونہ ہیں (33:21)۔

سیرت نبوی کے مطالعہ کے دو طریقے ہیں۔ ایک، تقدس کے جذبہ کے تحت مطالعہ کرنا، یعنی برکت حاصل کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو پڑھنا۔ دوسرے، سیرت سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے مطالعہ کرنا۔ قرآن کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیرت نبوی کے مطالعہ کا مقصد ''اسوہ نبوی'' کو جاننا اور اس سے رہنمائی حاصل کرنا ہے (33:21)۔

اس سلسلہ میں مولانا وحید الدین خاں صاحب اپنی کتاب عظمت اسلام کے ایک چیپٹر عظمت رسول میں لکھتے ہیں کہ برطانی مستشرق ای ای کلیٹ نے اپنی ایک کتاب میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا ہے۔ اس نے آپ کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تاریخ میں مذہب اسلام کے بانی سے زیادہ حیرت ناک کوئی کردار نہیں پایا جاتا۔ کوئی دوسرا آدمی مشکل سے ملے گا جس نے دنیا کی تقدیر پر اتنا گہرا اثر ڈالا ہو۔ بلاشبہ ان کو ناموافق حالات ملے مگر وہ جانتے تھے کہ ان حالات کو کس طرح اپنے حق میں موڑا جائے۔ انھوں نے مشکلات کا مقابلہ اس عزم کے ساتھ کیا کہ ناکامی سے کامیابی کو نچوڑیں۔ اگرچہ وہ کسی دوسرے مقام پر یا کسی دوسرے زمانہ میں اس طرح کامیاب نہیں ہو سکتے تھے مگر یہ بھی یقینی ہے کہ دوسرا کوئی آدمی سرے سے کامیابی ہی حاصل نہیں کرسکتا تھا:

"There is no more astonishing career in history than that of the founder of this religion (Islam), and scarcely any man has more profoundly influenced the destinies of the world. He was, of course, favoured by circumstances, but he knew how to turn them to his purposes, and he faced adversity with the determination to wring success out of failure. While he could not have succeeded in another place or at another time, it is tolerably certain that no one could have succeeded at all." (E.E. Kellett. A Short History of Religions, London, 1933. pp. 333-34)

ای ای کلیٹ کے مذکورہ بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے، مولانا وحید الدین خاں صاحب نے اپنی کتاب مطالعہ سیرت میں لکھا ہے کہ مغربی مستشرق کا مذکورہ جملہ قاری کے لیے ایک نشان راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے ذریعہ سیرت کے قاری کو ایک متعین رہنمائی ملتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن میں اسوۂ حسنہ کہا گیا ہے (دیکھیے مطالعہ سیرت، صفحہ 8)۔

ایک بات یہ قابل غور ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم تمام زمانوں کے لیے قابل تقلید نمونہ ہیں۔ مگر آپ نے اپنا قول وفعل قدیم عرب کے ریفرنس میں بیان کیا ہے۔ بعد کے زمانے میں اس کو قابل عمل بنانے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا جائے وہ اجتہاد کا طریقہ ہے۔ غالباً اسی وجہ سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروؤں کو اجتہاد پر ابھارا ہے، اور اجتہاد میں غلطی پر بھی ایک نیکی کی خوشخبری دی ہے (صحیح مسلم، حدیث نمبر 1716)۔

مولانا وحید الدین خاں صاحب نے جگہ جگہ سیرت سے سبق لینے کا طریقہ بتایا ہے، اور مثالوں سے اس کو واضح کیا ہے۔ تفصیل کے لیے ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً مطالعۂ سیرت، وغیرہ۔

یہاں چند مثالوں سے میں یہ وضاحت کروں گی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے موجودہ زمانے میں کیسے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے:

ممکن سے آغاز

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک اہم اصول ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں: مَا خُيِّرَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ أَمْرَيْنِ إِلَّا أَخَذَ أَيْسَرَهُمَا

(صحیح البخاری، حدیث نمبر 3560)۔ یعنی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ آسان کا انتخاب فرماتے۔

اس سے معاملات زندگی کے بارے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک نہایت اہم طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ ہے، اختیار ایسر یعنی موجود انتخابات (available options) میں نسبتاً آسان انتخاب (easier option) کو لے لینا اور مشکل انتخاب (harder option) کو چھوڑ دینا۔

اس اصول کا عملی نمونہ ہجرت جیسے اہم واقعہ میں نظر آتا ہے۔ اس وقت آپ کے لیے ایک انتخاب یہ تھا کہ آپ تمام اہل ایمان کو جمع کر کے مشرکین مکہ سے لڑ جائیں۔ دوسرا انتخاب یہ تھا کہ آپ مکہ کو چھوڑ کر دوسری بستی میں چلے جائیں۔ آپ نے دوسرے انتخاب کو لے لیا، کیوں کہ پہلا انتخاب زیادہ مشکل تھا۔ اس میں دوسری مشکلات کے علاوہ انسانی جان کی ہلاکت یقینی تھی۔

حدیبیہ کا واقعہ اسلام میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس موقع پر آپ کے لیے ایک انتخاب یہ تھا کہ زبردستی مکہ میں داخل ہونے کی کوشش کریں۔ اس کے مقابلے میں دوسرا انتخاب یہ تھا کہ صلح کر کے واپس لوٹ کر مدینہ چلے جائیں۔ آپ نے دوسرے انتخاب کو لے لیا، کیوں کہ پہلے انتخاب کا انجام انتہائی سنگین تھا۔ اس میں جان و مال کا ضیاع ہوتا اور نفرتیں مزید بڑھ جاتیں۔

یہی معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کا ہے۔ آپ نے ہمیشہ اختیار ایسر کے اصول پر عمل فرمایا ہے، آپ نے کبھی اختیار اعسر کو اپنا طریقہ نہیں بنایا۔ انسانی تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ مشکل انتخاب کو لینے میں اپنی طاقت بے فائدہ طور پر ضائع ہوتی ہے۔ مسئلہ کی سنگینی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک مسئلہ کے ساتھ بہت سے اور مسائل جڑ جاتے ہیں۔ وغیرہ۔

اس کے برعکس، آسان انتخاب کو لینا گویا ناممکن کو چھوڑ کر ممکن کا انتخاب کرنا ہے۔ ایسا انتخاب عمل کے نتیجہ خیز ہونے کی ضمانت ہے۔ وہ مسائل میں اضافہ کو روکنے والا ہے۔ اس میں ہر اگلا قدم آگے بڑھنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ وہ ایک مسئلہ کے ساتھ مزید مسائل پیدا کرنے کا سبب نہیں بنتا۔

ایمان کی حفاظت، دنیا کی قیمت پر

ہجرت کا واقعہ اسلامی تاریخ کا ایک روشن واقعہ ہے۔ اس وقت جو ایمانی واقعات پیش آئے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہجرت کرنے والوں میں ایک صحابی صہیب بن سنان الرومی تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد مدینہ پہنچے۔ حضرت صہیب جب مکہ سے نکلے تو قریش کے کچھ لوگوں نے ان کو پکڑا۔ انھوں نے کہا کہ تم مکہ میں آئے تو تم غریب تھے۔ پھر تم نے یہاں مال کمایا۔ اب تم اس مال کو لے کر مدینہ جانا چاہتے ہو تو ہم تم کو نہیں جانے دیں گے۔ انھوں نے کہا کہ اگر میں اپنا مال (دینار) تم کو دے دوں تو کیا تم مجھ کو جانے دو گے؟ انھوں نے کہا، ہاں۔ اس کے بعد صہیب نے اپنی جیب سے تمام دینار نکالے اور انھیں قریش کے حوالے کر دیا۔ اب قریش نے ان کو چھوڑ دیا اور وہ چل کر مدینہ پہنچ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ صہیب کی تجارت کامیاب رہی، صہیب کی تجارت کامیاب رہی۔ (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 477)

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن اور غیر مومن کے درمیان اگر مال یا زمین وغیرہ کے بارے میں کوئی نزاع پیدا ہو تو مومن کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ حق کے نام پر فریق ثانی سے لڑ جائے اور اس کے نتیجہ میں اپنے آپ کو ہلاک کر لے۔ ایسے معاملات میں اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ مال یا زمین کو فریق ثانی کے حوالے کر کے اپنی زندگی کو ایمان کی خاطر اس سے بچایا جائے۔ کیوں کہ ایمانی زندگی ہر دوسری چیز سے زیادہ قیمتی ہے۔

اسی طرح یہ واقعہ ایک داعی کے اخلاق کو بتاتا ہے۔ داعی یہ چاہتا ہے کہ مدعو سے کوئی بھی مادی جھگڑا نہ چھیڑے حتی کہ اگر کسی وجہ سے دونوں کے درمیان کوئی مادی جھگڑا چھڑ جائے تو داعی کو چاہیے کہ وہ یک طرفہ قربانی کے ذریعہ پہلی فرصت میں اس کو ختم کر دے تاکہ داعی اور مدعو کے درمیان نارمل تعلق بحال ہو سکے۔ خواہ اس کے لیے داعی کو یک طرفہ قربانی کیوں نہ دینا پڑے۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن میں پیغمبروں کی زبان سے ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا (14:12)۔ یعنی، جو تکلیف تم ہمیں دو گے ہم اس پر صبر ہی کریں گے۔

علم کی غیر معمولی اہمیت

جنگ بدر کا واقعہ اسلامی تاریخ کا نہایت اہم واقعہ ہے۔ اس جنگ میں اہل ایمان کو اللہ کی مدد سے مکمل فتح حاصل ہوئی۔ دشمن فوج کے ستّر آدمی مارے گئے اور ستّر آدمی قیدی بنا کر مدینہ لائے گئے۔ اس زمانہ میں مدینہ میں تعلیم نہیں تھی۔ مگر مکہ میں تعلیم تھی۔ چنانچہ مکہ کے یہ قیدی قدیم معیار کے مطابق تعلیم یافتہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ ان میں سے جو شخص مدینہ کے دس لڑکوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دے گا۔ اس کی اس تعلیمی خدمت کو فدیہ قرار دے کر ہم اسے چھوڑ دیں گے (فَجَعَلَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم فِدَاءَهُمْ أَنْ يُعَلِّمُوا أَوْلَادَ الْأَنْصَارِ الْكِتَابَةَ)۔ چنانچہ کئی قیدی اس طرح رہا ہو کر مکہ واپس گئے۔ (مسند احمد، حدیث نمبر 2216)

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ صفہ اسلام کا پہلا اسکول ہے۔ مگر تعلیم (education) کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بدر کے غیر مسلم قیدیوں کے ذریعہ مدینہ میں قائم کیا ہوا تعلیمی ادارہ (educational institution) معروف معنوں میں قدیم معیار کے مطابق پہلا اسکول ہے جو اسلام کی تاریخ میں خود پیغمبر اسلام نے قائم کیا تھا۔ اس اسکول کے طلبہ سب کے سب مسلمان تھے۔ مگر اس کے ٹیچر سب کے سب غیر مسلم بلکہ دشمن اسلام تھے۔ صفہ غریب مہاجر مسلمانوں کا ٹھکانا اور ان کے تزکیہ کا ایک مرکز تھا۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا ایک عملی نمونہ ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں علم کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ غیر مسلم (حتی کہ اسلام دشمنوں) سے بھی اگر علم سیکھنے کا موقع ہو تو ضرور سیکھنا چاہیے۔ موجودہ دور کی پلورل سوسائٹی (plural society) میں رسول اللہ کے اس عمل کو نمونہ بنا کر مسلم ملت کے ایجوکیشن کی نتیجہ رخی پلاننگ کی جاسکتی ہے۔

عورت کا میدانِ کار

قرآن کی سورہ الانعام میں نبیوں کا واقعہ بیان کرنے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے (6:90)۔ اس اعتبار سے قرآن میں بیان کردہ تمام دوسرے نبیوں کی باتیں بھی گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں خواتین کے تعلق سے ایک اہم

واقعہ میں ذکر کرنا پسند کروں گی۔ قرآن حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ انہیں بعض اسباب سے ملک مصر چھوڑنا پڑا۔ چنانچہ وہ مصر سے مدین کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں ایک مقام پر ایک سبق آموز واقعہ گزرا۔ وہ واقعہ یہ تھا کہ ایک بزرگ (بعض مفسرین کے مطابق حضرت شعیب علیہ السلام) کی دولڑکیاں ایک مقام پر آپ کو ملیں، جو اپنی بکریوں کو پانی پلانے کے لیے اپنی باری کا انتظار کررہی تھیں۔ حضرت موسی نے اس وقت ان کی مدد کی۔ یہ واقعہ قرآن کی سورہ قصص میں بیان کیا گیا ہے (28-28:23)۔

مذکورہ دونوں لڑکیاں باحیا اور ایمان والی تھیں۔ وہ اُس وقت غیر شادی شدہ تھیں۔ اس خاندان کی معاش کا ذریعہ مویشی پالنا تھا۔ یہ لڑکیاں روزانہ صبح کو اپنی بکریاں چرانے کے لیے اُن کو گھر سے دور لے جاتیں اور پھر شام کو پانی پلا کر انہیں گھر واپس لاتیں۔ اسی کے ساتھ یقیناً وہ دوسرے متعلق کام کرتی تھیں۔

خواتین کے تعلق سے ایک واقعہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے کا یہ ہے کہ صحابیات نے رسول اللہ سے آکر کہا کہ آپ ہمارے لیے ایک خاص دن مقرر کردیجیے، جس دن آپ ہم لوگوں کو نصیحت کیا کریں۔ رسول اللہ نے ان کے لیے ایک دن اور ایک خاص گھر مقرر کردیا، جہاں آپ عورتوں کو نصیحت اور تعلیم دیا کرتے تھے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 101)۔

ان دونوں واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں عورتوں کو گھر سے باہر کام کرنے کی اجازت ہے۔ ان کو اس بات سے منع نہیں کیا گیا ہے کہ وہ تعلیم حاصل کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں ان پر کوئی روک نہیں ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ یہ خواتین دینی حدود کی پابند ہوں۔

یہ چند مثالیں ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ کی سیرت کو ہر زمانہ میں اپنایا جاسکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سیرتِ رسول کے مطالعہ کا مقصد صرف عقیدت مندی کے جذبات کی تسکین نہ ہو، بلکہ اس کا مقصد یہ ہو کہ رسول اللہ کی سیرت سے اپنی زندگی کے ہر ہر پہلو کے لیے رہنمائی حاصل کی جائے۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ ہم تمام لوگوں کو رسول اللہ کے اسوہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین (ڈاکٹر فریدہ خانم)

خبرنامہ اسلامی مرکز-281

- موجودہ دور سوشل میڈیا کا ہے، اس لیے ہر جگہ سے ایسے تاثرات پڑھنے کو ملتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں سی پی ایس انٹرنیشنل کا مشن پہنچ رہا ہے۔ لوگ مولانا وحید الدین خاں صاحب کی کتابوں کو نہ صرف خود پڑھتے ہیں، بلکہ دوسروں تک ان کو پہنچاتے ہیں۔ مثلاً پاکستان سے مسٹر جلیل کاکڑ نے مولانا صاحب کی کتاب، الاسلام کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے فیس بک پیج پر یہ تاثر لکھا ہے:

  ''اگر آپ نے یہ کتاب (الاسلام) نہیں پڑھی ہے تو میرا مشورہ کہ لازمی طور پر پڑھیے۔ بار بار پڑھیے، سبقاً سبقاً پڑھیے۔ اس میں وہ سب کچھ ہے جو ایک دردِ دل رکھنے والا مسلمان، اسلام اور مسلمانوں کی کامیابی اور ترقی کے بارے میں سوچتا ہے۔''

- تمام انسانوں کے لیے قرآن کو قابلِ حصول بنانا سی پی ایس انٹرنیشنل کا بنیادی مقصد ہے۔ چنانچہ کوئی شخص، خواہ وہ کسی بھی مذہب کا ماننے والا ہو، قرآن کو اپنی قابل فہم زبان میں پڑھنا چاہتا ہے تو وہ ہماری ویب سائٹ پر آ کر فارم فل کرے، اس کے بعد اس کو ایک عدد ترجمہ قرآن فری آف کاسٹ بذریعہ پوسٹ بھیج دیا جاتا ہے۔ بشرطیکہ ایڈریس اور فون نمبر درست ہو۔ اس سلسلے میں ایک خاتون نے اپنا تاثر ان الفاظ میں ای میل کیا ہے:

I am writing to express my heartfelt thanks for providing me with a free copy of the English Quran. I recently filled out a form on your website requesting an English translation of Quran, and I was delighted to receive it very early. I am truly grateful for the work you do in providing free copies of the Quran to people. It is a beautiful and generous gesture that brings comfort to many. May Allah shower you with His blessings, guide you to success in all your endeavors, and reward you abundantly for your efforts. May your work continue to flourish and benefit countless individuals, and may it be a source of light and inspiration for all those who seek knowledge and guidance. May Allah grant you the best in this world and the Hereafter, and may He bless you with His mercy and grace at all times. I also wanted to take a moment to compliment the Quran you sent me. The translation is easy to read and understandable, and the text is presented in a clear and concise manner. I appreciate the effort that has gone into making the Quran accessible to people of all backgrounds, and I am sure it will be of great benefit to me and others who read it.and the additional information related to Islam and hadith you provided in the Quran is very informative and helpful in understanding the context and orgin of Islam. Your efforts to provide not just the Quran, but also additional resources to aid in understanding its teachings are truly commendable. Finally, I wanted to add a personal note of gratitude for the Goodword books team. Your dedication to providing this service is inspiring, and I am grateful for the opportunity to benefit from it. Thank you for all that you do, and may Allah reward you abundantly for your efforts. Sincerely (Yerza kazi, kazi****gmail.com)

- 26 فروری 2023 کا واقعہ ہے۔ اس دن میں گارلینڈ (ٹیکساس) کے ایک مال (mall) میں واقع ہاف پرائس بکس اینڈ میگزین اسٹور کے پاس سے گزری تو اس کی خاتون مینیجر سے پوچھا کہ کیا ان کے پاس اسلام پر کوئی کتاب ہے۔ اس نے کہا کہ ان کے پاس اسلام کے موضوع پر کوئی کتاب نہیں ہے۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ قرآن کا انگریزی ترجمہ فری تقسیم کے لیے رکھنا چاہیں گی۔ اس نے کہا بالکل! براہِ کرم آپ جو بھی عطیہ کرنا چاہتی ہیں، وہ ضرور لائیں۔ میں نے انھیں انگریزی ترجمۂ قرآن کا ایک باکس دیا، اس نے شکریہ کے ساتھ اس کو قبول کیا۔ یہ بک اسٹور ایک مشہور مال میں واقع ہے، اور وہاں ہر وقت لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ اس لیے اس بات کی قوی امید ہے کہ بہت سے لوگ اسٹور سے ترجمۂ قرآن کو حاصل کریں گے۔ (مزکوشر اظہار، سی پی ایس امریکا)
- ایچ ستیا یونیورسٹی (ASU) گروگرام، ہریانہ نے سی پی ایس انٹرنیشنل دہلی کے اشتراک سے انٹرفیتھ ڈائلاگ اینڈ پیس کے موضوع پر 25 ستمبر 2023 کو یونیورسٹی کے اندر ایک ورکشاپ کا انعقاد کیا تھا۔ اس میں سی پی ایس دہلی کے دو ممبران مزا ستھی ملہوترا اور مسٹر وکرانت ڈاگر نے شرکاء کے سامنے موضوع کی مناسبت سے گفتگو کی، اور پروگرام کے اختتام پر تمام لوگوں کو سی پی ایس انٹرنیشنل کا لٹریچر دیا گیا۔ تمام لوگوں نے نہایت شوق کے ساتھ گفتگو سنی اور شکریہ کے ساتھ اسپریچول تحفہ حاصل کیا۔
- مسٹر عمار، سی پی ایس دہلی کے نوجوان ممبر ہیں۔ انھوں نے 6 نومبر 2023 کو دہلی میں واقع نہرو میموریل میوزیم اور لائبریری میں مولانا وحید الدین خاں صاحب کی انگریزی کتابوں کا ایک سیٹ (بشمول انگریزی اور ہندی تراجم قرآن) بطور تحفہ دیا۔ بقول مسٹر عمار، ڈاکٹر روی کے مشرا (ڈپٹی ڈائریکٹر) نے انتہائی خوشی اور اپنائیت کے ساتھ میرا استقبال کیا اور تمام کتابوں کو شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔ انہوں نے مولانا اور ان کے کاموں کی بہت تعریف کی۔ انہوں نے کہا کہ مولانا صاحب واقعی ایک استثناء انسان اور سچے محب وطن تھے۔ ملک میں بہت کم لوگ ان کی مانند ہوئے ہیں۔ اس وقت ان کے ساتھ دو مہمان اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے بھی نہایت دلچسپی کے ساتھ مولانا اور سی پی ایس مشن کے بارے میں سنا۔ انہوں نے مولانا کے لیے رضا کارانہ طور پر کام کرنے کی میری کوششوں کو بھی بہت سراہا۔

اعلان

سی پی ایس انٹرنیشنل، نئی دہلی کی جانب سے ہندستان کے دینی مدارس اور دیگر ملی و تعلیمی اداروں کو مولانا وحید الدین خاں صاحب کی کتابیں ہدیے میں بھیجی جا رہی ہیں۔ اس مقصد کے تحت ادارہ کی جانب سے مسٹر آصف خان مدارس میں جاتے ہیں، اور وہاں کی انتظامیہ سے اجازت حاصل کرتے ہیں۔ پھر ان مدارس کو کتابیں بھیجی جاتی ہیں۔ قارئین الرسالہ اور دوسرے خواہش مند حضرات سے گزارش ہے کہ وہ آصف صاحب سے مندرجہ ذیل نمبر پر رابطہ قائم کر کے اس سلسلے میں ان کا تعاون فرمائیں۔ شکریہ

رابطہ نمبر: +91-99185785630

सारा ख़ून

प्रोफ़ेसर पाल डिरॅक (Paul Dirac) 1902 में पैदा हुए। अक्तूबर 1984 में उन्होंने 82 साल की उम्र में फ्लोरिडा में वफ़ात पाई। वह जदीद (आधुनिक) दौर में न्यूटन और आइंस्टाइन के बाद सबसे ज़्यादा मुमताज़ और बड़े साइंसदां समझे जाते हैं। उनको नोबेल प्राइज़ और दूसरे बहुत से इनाम व सम्मान हासिल हुए।

पाल डिरॅक के नाम के साथ क्वांटम मेकानिकल थ्योरी जुड़ी हुई है। यह साइंसी नज़रिया (सिध्दांत) एटम के बेहद छोटे ज़र्रात (कणों) के बारे में है। उन्होंने सबसे पहले एंटी मीटर की पेशेनगोई (भविष्यवाणी) की जो बाद में ज़्यादा तहक़ीक़ात से साबित हो गया। गार्जियन (4 नवम्बर 1984) ने पाल डिरॅक पर लेख छापा तो उसकी सुर्ख़ी इस तरह लगाई:

Prophet of the Anti-Universe.

पाल डिरॅक ने एटम में पहला एंटी पार्टिकल खोजा, जिसे पाज़िट्रान (Positron) कहा जाता है। 'इस खोज़ ने न्यूक्लेयर फ़िज़िक्स में एक इंक़िलाब बरपा कर दिया। लोग जब पाल डिरॅक से पूछते कि आपने सब-एटोमिक की नौइयत और विशेषताओं के बारे में अपना चौंका देने वाला नज़रिया कैसे खोज निकाला तो वह बताते कि वह अपने स्टडी रूम में इस तरह फ़र्श पर लेट जाते थे कि उनका पाँव ऊपर रहता था ताकि ख़ून उनके दिमाग़ की तरफ़ दौड़ेः

> When people asked him how he got his startling ideas about the nature of sub-atomic matter, he would patiently explain that he did so lying on the floor of his study with his feet up so that the blood rushed to his head.

देखने में यह एक लतीफ़ा लगता है। लेकिन हक़ीक़त यह है कि कोई बड़ा फ़िक्री और बौद्धिक काम वही शख़्स कर पाता है जो अपने सारे जिस्म का ख़ून अपने दिमाग़ में समेट दे।

ज़्यादातर लोगों का हाल यह होता है कि वे अपनी क़ुव्वत और क्षमता को तक़सीम (विभाजित) किए हुए होते हैं। वे अपने आपको एक मर्क़ज़ या केन्द्र पर एकाग्र नहीं किए होते। इसीलिए वे एक अधूरी ज़िन्दगी गुज़ार कर इस दुनिया से चल जाते हैं। हर काम आदमी से उसकी पूरी क़ुव्वत मांगता है। वही शख़्स बड़ी कामयाबी हासिल करता है जो अपनी पूरी क़ुव्वत को एक काम में लगा दे।

आदमी की परख

अल्लामा इब्ने कय्यिम (691-751 हि.) ने अपनी किताब तरीक़ुल हिजरतेन में एक वाकिया इस तरह लिखा है:

हज़रत सुहैल बिन सअद कहते हैं कि रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम ने सूर: मुहम्मद की यह आयत तिलावत फ़रमाई, "क्या ये लोग कुरआन में ग़ौर नहीं करते या दिलों पर उनके ताले लगे हुए हैं।" उस वक़्त रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम के पास एक लड़का बैठा हुआ था। उसने आयत सुन कर कहा, "हां, ख़ुदा की क़सम, ऐ अल्लाह के रसूल, बेशक दिल पर उसके ताले हैं। और उनको कोई नहीं खोल सकता, सिवा उसके जिसने उसको लगाया है।" फिर जब हज़रत उमर बिन ख़त्ताब खलीफा हुए तो उन्होंने उस लड़के को बुलाया, ताकि उसको किसी काम पर लगाएं और उन्होंने कहा, "लड़के ने यह जो बात कही वह अक़्ल से कही।"

जो लोग सामूहिक मामलों के ज़िम्मेदार हों, उनके लिए व्यक्तियों की बेहद अहमियत होती है। किसी संस्था या किसी सामूहिक काम के बेहतर ढंग से पूरा होने में यही व्यक्ति काम आते है। ऐसे लोग हमेशा समाज में मौजूद रहते हैं, मगर जिन ज़िम्मेदारों के हाथ में व्यक्तियों को चुनने की ज़िम्मेदारी हो, उनके अन्दर एक गुण ज़रूर पाया जाना चाहिए, और वह यह कि वे आदमी की निजी क़ाबिलीयत की बुनियाद पर उसका चुनाव करें न कि किसी और बुनियाद पर।

किसी संस्था के ज़िम्मेदार में अगर पक्षपात हो; अगर वह खुशामदी इन्सानों को पसंद करता हो; अगर वह यह चाहता हो कि उसके आसपास के तमाम लोग उससे कमतर सलाहियत वाले हों, ताकि उसकी निजी बड़ाई कायम रहे- ज़िम्मेदार के अन्दर अगर इस क़िस्म का मिज़ाज हो तो वह संस्था को बेकार इन्सानों का कबाड़खाना बना देगा। इसके बरअक्स अगर उसके अन्दर वह मिज़ाज हो, जिसका एक नमूना ऊपर के वाक़ए में नज़र आता है तो उसका संगठन एक ऐसा बाग़ होगा, जिसमें हर किस्म के बेहतरीन दरख़्त लगे हुए हों और हमेशा वह अपना फल देता रहे।

मानवीय गुण

क़ुरआन में मामूली लफ़्ज़ी फ़र्क के साथ दो जगहों पर यह बात कही गई है कि अल्लाह किसी क़ौम की हालत को उस वक़्त तक नहीं बदलता जब तक कि वह उसको न बदल डाले जो उसके जी में है (अर रअद)।

इस ख़ुदाई सुन्नत से मालूम होता है कि किसी गिरोह के क़ौमी और इज्तिमाई हालात उसके वैयक्तिक हालात पर निर्भर हैं। इसको दूसरे लफ़्ज़ों में इस तरह कहा जा सकता है कि क़ौमी हैसियत का दारोमदार मानवीय गुणों पर है। किसी क़ौम के लोगों में इन्सानी या अख़्लाक़ी या नैतिक खूबियां जैसी होंगी, उसी के मुताबिक उसको दुनिया में सामूहिक मुकाम हासिल होगा, न उससे कम और न उससे ज़्यादा।

इस मामले को समझने के लिए मौजूदा ज़माने की एक मिसाल लीजिए। यह बात सभी लोग मानते हैं कि जापान ने दूसरे विश्व युद्ध के बाद बहुत ग़ैरमामूली तरक्की की है। इस तरक्क़ी का एक खास राज़ उनकी एकता है। जापानी हर काम को एकजुट होकर करते हैं। एकता को आखिरी वक़्त तक बरकरार रखते हैं। इसकी वजह से उनकी ताक़त बहुत बढ़ जाती है। वे हर मामले में ग़ैरमामूली तौर पर कामयाब रहते हैं।

जापान की इस एकता का राज़ वहां के लोगों का वैयक्तिक स्वभाव है, जो तक़रीबन तमाम जापानियों के अन्दर पाया जाता है। प्रोफ़ेसर ची नकानी (Chie Nakane) की जापानी भाषा में एक किताब है, जिसका तर्जुमा अंग्रेजी में जापानी समाज (Japanese Society) के नाम से छपा है। इस किताब में जापानी प्रोफ़ेसर ने लिखा है कि जापानी का वैयक्तिक मिज़ाज यह होता है कि वह समझता है कि मैं किसी के मातहत हूं,

I am under someone

दूसरे लफ़्ज़ों में यह कि हर जापानी अधीनता-भाव में जीता है। इसलिए जब भी कोई सामूहिकता कायम होती है तो वह फ़ौरन उससे जुड़ जाता है। वह तन्ज़ीम यानी संगठन के नेता को फ़ौरन अपना नेता मान लेता है, क्योंकि वह पहले ही से यह माने हुए था कि मैं किसी के मातहत हूं —यह है जापानियों की उस एकता का राज़ जिसके नतीजे में उन्होंने मौजूदा ज़माने में अप्रत्याशित तरक्की की है।

अब मौजूदा ज़माने के मुसलमानों को देखिए। मुसलमानों का मामला जापानियों के बिल्कुल बरअक्स है। मसजिद से लेकर सियासत तक कोई मामला ऐसा नहीं, जिसमें मुसलमान मुत्तहिद या एक हों। मौजूदा मुसलमान दुनिया की सबसे ज़्यादा बरबाद क़ौम हैं, और इसकी सबसे बड़ी वजह बेशक उनमें इत्तिहाद और एकता का न होना है। इस 'बेइत्तिहादी' ने एक अरब इन्सानों की महान् क़ौम को दुनिया की सबसे कमज़ोर क़ौम बना दिया है।

मौजूदा मुसलमानों की इस 'बेइत्तिहादी' का सबब क्या है? इसका सबब, दोबारा, उनके लोगों का वह ग़लत मिज़ाज है जो किसी भी इत्तिहाद की राह में एक स्थायी रुकावट बन गया है।

मौजूदा ज़माने में जब मुसलमान पस्ती, मग़लूबियत और पतन का शिकार हुए तो उनके रहनुमाओं की तशख़ीस (मर्ज़ की जांच) यह थी कि पश्चिम के प्रभाव में आ जाने ने उनको पस्ती से दो-चार किया। इसलिए तमाम रहनुमाओं ने एक या दूसरी सूरत में यह किया कि इस्लाम को गर्वपूर्ण अन्दाज़ में पेश करना शुरू कर दिया, ताकि उनके प्रभुत्व को ख़त्म कर सकें। इसका नतीजा यह है कि

मुसलमानों की पूरी नस्ल गर्व और हाकिमियत (शासकत्व) के एहसास पर परवरिश पा कर उठी है। हर आदमी नज़रिए और आस्था के लिहाज़ से अपने अन्दर बरतरी और बड़प्पन का जज़्बा लिए हुए है। क्योंकि यही जज़्बा उसके अन्दर उभारा गया था।

यह मानसिकता एकता की क़ातिल है। एकता उस वक़्त कायम होती है जबकि एक शख़्स को बड़ा बना कर बाक़ी तमाम लोग उसके मुक़ाबले में छोटे बनने पर राज़ी हो जाएं। मगर मुसलमानों की गर्व की मानसिकता इसमें रुकावट है। इसका नतीजा यह है कि अब हर आदमी सरदार बनना चाहता है। हर आदमी चाहता है कि उसकी बात चले। हर आदमी चाहता है कि हाकिमाना सीट पर बैठे। ऐसी हालत में एकता कायम होना मुमकिन नहीं। और मुसलमानों की यही वह मानसिकता है, जिसने आज उनके दरमियान किसी भी एकता को सरासर नामुमकिन बना दिया है।

मौजूदा ज़माने के मुसलमानों का अस्ल मसला सत्ता को खोना नहीं, बल्कि इन्सानी गुणों को खोना है। मौजूदा मुसलमान अपने रहनुमाओं और लीडरों की ग़लत रहनुमाई के नतीजे में ऊंचे मानवीय गुणों से खाली हो गए हैं। अब सबसे पहला ज़रूरी काम यह है कि मुसलमानों के अन्दर वे गुण पैदा किए जाएं जो आला इन्सानियत का निर्माण करते हैं। जब तक यह काम नहीं किया जाएगा मुसलमानों के हालात बदल नहीं सकते। कोई दूसरी कोशिश चाहे वह कितने ही बड़े पैमाने पर की जाए, मुसलमानों के लिए किसी नए भविष्य का निर्माण नहीं कर सकती।

इच्छा-सूची

क्लियरी सिम्पसन अमरीका की एक उच्च शिक्षित महिला हैं। शिक्षा पूरी करने के बाद वह अस्थायी तौर पर विभिन्न काम करती रही हैं। यहां तक कि उनकी आकांक्षाओं के मुताबिक उनको अमरीकी पत्रिका टाइम में अपनी पसंद का

काम मिल गया। इस समय वह टाइम के न्यूयार्क के दफ्तर में एडवरटाइजिंग सेल्स डायरेक्टर हैं।

टाइम के 15 अगस्त 1991 के अंक (पेज 4) में उनका हंसता हुआ फोटो छपा है। वह इस पद के मिलने पर बेहद खुश हैं। तस्वीर के नीचे उनका बयान इन शब्दों में दिया गया है —टाइम के लिए काम करना हमेशा से मेरी इच्छा सूची में था:

Working for Time was always on my wish list.

हर आदमी किसी चीज़ को सब से बड़ी चीज़ समझता है। वह उसकी तमन्ना में जीता है। वह उसका सपना देखता है। उसके सुबह-शाम उसकी यादों में गुज़रते हैं। वह इस इंतिज़ार में रहता है कि कब वह दिन आए जब वह अपनी इस प्रिय चीज़ को पा ले। यह चीज़ उसकी इच्छा सूची में सब से ज़्यादा अहमियत के साथ दर्ज होती है। मौजूदा दुनिया में कोई भी ऐसा आदमी नहीं जिसके लिए कोई न कोई चीज़ इस तरह आकांक्षा केन्द्र न बनी हुई हो।

मोमिन वह है जिसने जन्नत को अपनी इच्छा-सूची (विश लिस्ट) में लिख रखा हो- हमेशा कायम रहने वाली उच्चस्तरीय नेमतों की वह दुनिया जहां वह अपने रब को देखेगा, जहां सच्चे इन्सानों से उसकी मुलाकात होगी, जहां वह ख़ुदा की रहमतों के साए में ज़िन्दगी गुज़ारेगा। वह दुनिया जो बेकार और अशोभनीय बातों से मुक्त होगी, जहां अनाचार और ज़ोर-ज़बरदस्ती को ख़त्म कर दिया जाएगा, जिसका माहौल चारों तरफ़ हम्द, सलामती और शांति से भरा हुआ होगा, जहां डर और रंज को ख़त्म कर दिया जाएगा, जहां ऐसी आज़ादी होगी जिस पर कोई क़ैद नहीं, जहां ऐसी लज्ज़तें होंगी, जिनकी कोई सीमा नहीं।

जब किसी शख़्स पर ज़िन्दगी की हक़ीक़त खुलती है तो वह यह भी जान लेता है कि उसके लिए सबसे बड़ी चीज़ जन्नत है। वह जन्नत का लालसी बन जाता है। और जन्नत उसके लिए है जो लालसा (लोलुपता) की हद तक जन्नत का तलबगार बन गया हो।

इन्साफ़ का तरीका

मक्का के आरंभिक ज़माने में जब कुरैश की ज्यादतियां बहुत बढ़ गईं तो रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम ने मुसलमानों से कहा कि तुम लोग मक्का को छोड़ कर हबश चले जाओ। हबश में एक बादशाह है, जिसके यहां किसी पर कोई ज़ुल्म नहीं किया जाता। तुम लोग उसके मुल्क में चले जाओ। यहां तक कि अल्लाह तआला तुम्हारे लिए कोई गुंजाइश पैदा कर दे।

तो इस तरह सहाबा एक सौ से ज़्यादा तादाद में अपना वतन छोड़ कर हबश चले गए। मक्का के कुरैश को मालूम हुआ तो उन्होंने मश्वरा करके अपने दो आदमियों को हबश रवाना किया। वहां उन्होंने बादशाह के दरबारियों को तोहफ़े दे कर इस पर राज़ी कर लिया कि बादशाह के यहां वे उनकी सिफ़ारिश करेंगे। इसके बाद मक्का का प्रतिनिधि मंडल हबश के बादशाह नजाशी के दरबार में दाखिल हुआ। उन्होंने बादशाह से कहा कि हमारे शहर के कुछ नादान लोग अपने बाप-दादाओं का दीन छोड़ कर आपके मुल्क में आ गए हैं। अब उनके ख़ानदान और क़बीले के लोगों ने हमको यहां भेजा है कि हम उन्हें उनके घरों की तरफ़ वापस ले जाएं। हम चाहते हैं कि आप हमें इसकी इजाज़त दें दें और उनको हमारे हवाले कर दें। तमाम दरबारियों ने उनकी इस मांग की हिमायत की।

मक्का का प्रतिनिधिमंडल यह चाहता था कि सिर्फ़ उनके कहने पर बादशाह मुसलमानों को उनके हवाले कर दे। और ख़ुद मुसलमानों को बुला कर उनसे कोई पूछताछ न करे। जब उन्होंने बादशाह से अपनी इस ख़्वाहिश का इज़हार किया तो बादशाह बिगड़ गया। उसने कहा, "ख़ुदा की क़सम नहीं। मैं हर्गिज़ उनको तुम्हारे हवाले नहीं करूंगा, जब तक ऐसा न हो कि मैं उनको अपने यहां बुलाऊं और उनसे बात करूं और देखूं कि उनका मामला क्या है।

मूसा इब्ने उक्बा कहते हैं कि नजाशी के दरबारियों ने मक्का के प्रतिनिधिमंडल की मांग की हिमायत की और बादशाह को मश्वरा दिया कि वह मुसलमानों

को फ़ौरन उनके हवाले कर दे। मगर नजाशी ने कहा कि ख़ुदा की क़सम नहीं। मैं इस मामले में कोई फ़ैसला नहीं कर सकता, जब तक उनकी बात न सुन लूं और यह जान लूं कि वे लोग किस चीज़ पर हैं।

इसके बाद नजाशी ने हुक्म दिया कि मक्का के जो मुसलमान हमारे मुलक में आए हैं, उनको मेरे दरबार में हाज़िर किया जाए। वे लोग लाए गए। वे लोग दरबार में दाखिल हुए तो उन्होंने वहां के आम तरीके के मुताबिक बादशाह को सज्दा नहीं किया। नजाशी एक ईसाई बादशाह था। अपने अक़ीदे के मुताबिक वह हज़रत ईसा को ख़ुदा का बेटा मानता था। मगर बातचीत के दौरान जब हज़रत ईसा का ज़िक्र हुआ तो सहाबियों के नुमाइन्दे जाफ़र बिन अबी तालिब ने साफ़ कह दिया कि वह ख़ुदा के पैग़म्बर थे, वह ख़ुदा के बेटे न थे। वग़ैरह।

नजाशी ने पूरी बात मालूम करने के बाद प्रतिनिधि मंडल के अनुदान और तोहफ़े वापस कर दिए। उसने उनसे कहा कि तुम लोग अपने मुल्क लौट जाओ। मैं इन मुसलमानों को हर्गिज़ तुम्हें सौंपने वाला नहीं। वे मेरे मुल्क में जब तक चाहेंगे रहेंगे (सीरत इब्ने कसीर, दूसरा हिस्सा, पेज 22)

यही इन्साफ़ का सही तरीक़ा है। इन्साफ़ एक तरफा कार्रवाई का नाम नहीं। इन्साफ़ दो तरफ़ा तहक़ीक़ के बाद न्यायपूर्ण फ़ैसला देने का नाम है। रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम की प्रत्यक्ष पुष्टि के मुताबिक, नजाशी का अमल बेशक इन्साफ़ का ऊँचा नमूना है।

हक़ीक़त यह है कि जब भी कोई ऐसा मसला सामने आए जो दो पक्षों से ताल्लुक रखता हो तो ऐसे मौके पर एक पक्ष की बात सुन कर फ़ैसला कर देना सरासर ज़ुल्म है। ऐसा करना किसी भी शख़्स के लिए दुरुस्त नहीं, चाहे वह कितने ही बड़े मन्सब और ओहदे पर क्यों न हो।

बादशाह नजाशी ने बाद में इस्लाम क़बूल कर लिया था। इस लिहाज़ से नजाशी का नमूना एक न्यायप्रिय और मुस्लिम बादशाह का नमूना है। नजाशी इस मामले में न मक्का वालों के तोहफ़ों और नज़रानों से प्रभावित हुआ, न

उसने अपने दरबारियों और करीबी लोगों के मश्वरे और सिफ़ारिश को माना, यहां तक कि नजाशी ने इसकी परवाह भी नहीं की कि मुसलमानों ने ख़ुद उसकी ताज़ीमो तकरीम नहीं की यानी उसके सामने सज्दा नहीं किया, जिसका वह आदी था। और इस तरह वे भरे दरबार उसकी तौहीन करने वाले बने। इतना ही नहीं, उन्होंने बादशाह और सारी क़ौम के मज़हबी अक़ीदों का खंडन किया और उसको ग़लत बताया।

इन सब प्रतिकूल पहलुओं के बावजूद नजाशी ने किसी बात की कोई परवाह नहीं की। उसने मामले के सिर्फ़ अद्ल व इन्साफ़ के पहलू को देखा, दूसरे तमाम के निजी और ग़ैर-निजी पहलुओं को उसने सिरे से नज़रअन्दाज़ कर दिया। उसने दोनों पक्षों की बात सुन कर मामले की निष्पक्ष तहकीक की, और फिर जो इन्साफ़ का तक़ाज़ा था, उसके मुताबिक़ फ़ैसला सुना दिया।

ये वाक़िआत यह साबित करते हैं कि शाह नजाशी के अन्दर इन्सानियत का जज़्बा पूरी तरह मौजूद था। ख़ुदा ने जिस फ़ितरत पर उसको पैदा किया था, उस फ़ितरत को उसने अपनी अस्ल हालत पर बाक़ी रखा था।

यही वजह है कि हक़ व सच्चाई जब उसके सामने आई, तो उसको समझने में उसे देर नहीं लगी। हालांकि ज़ाहिरी तौर पर वह उसकी धारणा के ख़िलाफ़ था, मगर उसने किसी लाग-लपेट के बिना और किसी पूर्वाग्रह के बिना उसकी सच्चाई का एतिराफ़ किया। वह फ़ौरन उसके आगे झुक गया।

अपनी इन खुसूसियात की बिना पर वह इस काबिल ठहरा कि अल्लाह तआला उस पर रहमत की नज़र करे। उसको ईमान की तौफीक़ दे कर उसको आख़िरत की हमेशा रहने वाली नेअमतों का मुस्तहक़ बनाए। रिवायात से साबित है कि शाह नजाशी ने इस्लाम क़बूल किया और रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम और सहाबा ने उसके हक़ में अल्लाह तआला से ख़ास दुआएं कीं।

सबसे बड़ी नेकी यह है कि आदमी अद्ल व इन्साफ़ के मुताबिक़ फ़ैसला करे, चाहे उसके लिए उसके ऊपर कोई दबाव न हो, चाहे न्यायपूर्ण फ़ैसला करना उसके स्वार्थ के खिलाफ़ क्यों न हो। यही वे बुलन्द रूहें हैं, जिनको क़ियामत में अर्शे-ख़ुदावन्दी के साए में जगह दी जाएगी।

अल्लाह के डर की वजह से कोड़ा हाथ से गिर पड़ा

अबू मसऊद बदरी रज़ि अल्लाहु अन्हु कहते हैं। एक रोज़ मैं किसी बात पर अपने गुलाम से ख़फ़ा हो गया और उसको कोड़े से मारने लगा। इतने में पीछे से आवाज़ सुनाई दी: "ऐ अबू मसऊद, जान लो। " मगर मैं गुस्से की हालत में था। आवाज़ को पहचान न सका। आवाज़ देने वाला जब मेरे क़रीब आ गया तो मैंने देखा कि वह रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम हैं। आप फ़रमा रहे थे:अबू मसऊद जान लो, तुमको जितना क़ाबू उस शख़्स पर है, उससे ज़्यादा क़ाबू अल्लाह को तुम्हारे ऊपर है।

यह सुन कर कोड़ा मेरे हाथ से गिर गया। मैंने कहाः "अब कभी मैं किसी गुलाम को न मारूंगा। मैं इस गुलाम को अल्लाह की खुशी के लिए आज़ाद करता हूं। " रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम ने फ़रमायाः

अगर तुम ऐसा न करते आग की लपट तुमको छू लेती (*मुस्लिम*)।

ये विशेषज्ञ

प्रोफेसर राज कृष्ण (1925-1985) भारत के पचास बड़े प्रतिभाशाली लोगों में गिने जाते थे।

अर्थशास्त्र में ग़ैर-मामूली महारत की वजह से वह अंतर्राष्ट्रीय शोहरत के मालिक थे। वह देश के बड़े-बड़े आर्थिक पदों पर रहे। आख़िर में वह एफ.ए.ओ. (फ़ूड एंड एग्रीकल्चर आर्गेनाइज़ेशन) के एक प्रोजेक्ट के तहत तीन

महीने के लिए रोम (इटली) गए थे। अभी वह अपना काम पूरा भी न कर सके थे कि 21 मई 1985 को अचानक हृदय गति रुक जाने से उनका देहांत हो गया। उनकी उम्र सिर्फ़ 59 साल थी (टाइम्स ऑफ इंडिया, 22 मई 1985)

प्रोफेसर राज कृष्ण कृषि अर्थशास्त्र के एक माने हुए विशेषज्ञ थे। उन्होंने इस समस्या का विशेषज्ञता के साथ अध्ययन किया था कि तीसरी दुनिया के ग़रीबी के माहौल में रोज़गार का मसला किस तरह हल किया जाए:

> He was an acknowledged expert in agricultural economics and had specialised in the study of employment conditions of poverty in the third world.

कैसे अजीब होंगे दुनिया की समस्याओं के वे विशेषज्ञ जिनको ख़ुद अपने मसले की ख़बर न हो।

इन्सान का हाल भी कैसा अजीब है। वह अपने कल को नहीं जानता और दूसरों के भविष्य पर रिसर्च करता है।

वह ख़ुद वैचारिक दरिद्रता से ग्रस्त होता है और दूसरों की आर्थिक दरिद्रता पर भाषण के चमत्कार दिखाता है।

दुनिया की समस्याओं की विशेषज्ञता पर उसे बड़े-बड़े सम्मान दिए जाते हैं, पर जब तजुर्बा होता है तो पता चलता है कि वह अपने क़रीबी मसले का जानकार भी न था।

कैसा अजीब है लोगों का जानना और कैसा अजीब है उनका न जानना !

उदार हृदयता

अमीर मआविया की ख़िलाफ़त के ज़माने की घटना है। उस ज़माने में रोम की पूर्वी सल्तनत के अक्सर हिस्से फतह हो चुके थे। रोमी बादशाह पराजित होकर कुस्तुनतुनिया (तुर्की) के किले में रहने लगा था। फिर भी सरहद पर वह मुसलमानों से छेड़छाड़ करता रहता था। इसी क़िस्म की एक झड़प में एक बार

रोमियों ने कुछ मुसलमानों को क़ैद कर लिया, जिनमें कुरैश का एक आदमी भी शामिल था। रोमी बादशाह को मालूम हुआ तो उसने कहा कि वे लोग मेरे सामने हाज़िर किए जाएं।

मुसलमान क़ैदी इस हाल में दरबार में लाए गए कि उनके हाथ बंधे हुए थे और पांव में बेड़ियां पड़ी हुई थीं। रोमी बादशाह ने उनसे बहुत बेइज़्ज़ती के साथ बातचीत की। उसने कहा कि तुम जैसे लोगों की यही सज़ा है। हम तुमको ऐसी सज़ा देंगे, यहां तक कि तुम मर जाओ और तुम्हारी क़ौम के लोगों को सबक मिले ताकि वे फिर हमारे इलाके की तरफ़ देखना छोड़ दें।

कुरैशी को बादशाह की बात सुनकर गैरत आ गई। उसने बादशाह को सख़्त अन्दाज़ में जवाब दिया। उसने कहा कि जब तक तुम्हारी इस्लाम दुश्मनी बाक़ी है तुम्हारे ख़िलाफ़ हमारी जंग जारी रहेगी। और तुम जान लो कि ख़ुदा के रास्ते में हमारा खून बहुत सस्ता है, मगर वह उस वक़्त बहुत कीमती हो जाएगा, जबकि तुम्हारे जैसा बादशाह हमको क़त्ल करे।

कुरैशी का यह जवाब सुनकर एक बितरीक़ (patriarch) को गुस्सा आ गया। वह उठ कर कुरैशी के पास आया और उसके चेहरे पर दाएं-बाएं दो तमांचे मारे। कुरैशी के हाथ बंधे हुए थे। इसलिए उस वक़्त कुछ नहीं कर सकता था। अलबत्ता अपनी इस बेइज़्ज़ती पर वह चीख़ पड़ा:

कुरैशी बुलन्द आवाज़ से चीखा: ऐ मआविया, तुम कहां हो कि इन ज़लील लोगों से इन्तिक़ाम लो जिन्होंने तुम्हारे एक शरीफ़ आदमी को तमांचा मारा है। फिर वह बतरीक़ की तरफ़ मुखातिब हुआ और बोला कि मैं ख़ुदा की क़सम खाकर कहता हूं कि तुम्हारे साथ मेरा एक दिन आएगा जबकि तुम जान लोगे कि मैं कौन हूं।

इस घटना की ख़बर कुस्तुनतुनिया से दिमिश्क पहुंची। अमीर मआविया को सुनकर बहुत रंज हुआ। उन्होंने तय किया कि इस सिलसिले में ज़रूर कुछ न कुछ करना चाहिए। मआविया ने सबसे पहले रोमी बादशाह से तबादले

(एक्सचेंज) की बुनियाद पर कैदियों की रिहाई की बातचीत की। यहां तक कि मुस्लिम कैदियों की तादाद के मुकाबले में रोमी कैदियों की ज़्यादा तादाद को वापस करके अपने कैदियों को रिहा करा लिया।

इसके बाद अमीर मआविया ने निहायत ख़ामोशी के साथ एक मन्सूबा बनाया। उन्होंने तलाश करके सोर (शाम) के एक आदमी को हासिल किया। वह व्यापारी था और रोमी जुबान जानता था। अमीर मआविया ने उसे बहुत सारे सोने के दीनार दिए। उसको पूरा मन्सूबा बताया और कहा कि तुम जाओ और किसी न किसी तरह उस बतरीक़ को पकड़ कर दिमिश्क ले आओ।

उस आदमी ने व्यापारी के रूप में सफर किया और इस तरह दिमिश्क से कुस्तुनतुनिया पहुंचा। बतरीक़ के बारे में मालूमात हासिल करके उसके ताल्लुकात पैदा किए। उसको क़ीमती तोहफ़े (इत्र, जवाहरात, रेशमी कपड़े वग़ैरह) पेश किए। इस तरह वह कई बार दिमिश्क से कुस्तुनतुनिया और कुस्तुनतुनिया से दिमिश्कि आता-जाता रहा। और बतरीक़ को तोहफ़े देता रहा। यह पूरा मामला इतनी राज़दारी के साथ हुआ कि व्यापारी और अमीर मआविया के सिवा किसी और को इसकी भनक तक न थी।

इस तरह लम्बा अर्सा गुज़र गया। जब बतरीक़ से काफ़ी ताल्लुकात हो गए तो उसने ख़ुद ही कुछ ख़ास तोहफ़े लाने की फ़रमाइश की। व्यापारी उससे वादा करके वापस हुआ। वह दिमिश्क आया। यहां उसने निहायत तेज़ रफ्तार ऊंटनी हासिल की। ऊंटनी को एक आदमी के साथ लाकर एक ख़ास मुकाम पर ठहराया। इसके बाद वह बतरीक़ के पास गया और कहा कि मैं तुम्हारे तमाम तोहफ़े ले आया हूं। तुम मेरे साथ चलो। इस तरह बहाने से वह बतरीक़ को वहां ले गया। यहां दोनों ने अचानक बतरीक़ को पकड़ लिया। उन्होंने जल्दी से उसके हाथ-पांव बांध दिए। और उसको सवारी पर बिठा कर हवा की रफ्तार से दिमिश्क की तरफ़ रवाना हो गए।

बतरीक़ जब दिमिश्क पहुंच गया तो अमीर मआविया ने एक मजलिस में बहुत से लोगों को जमा किया और उस कुरैशी को भी बुलाया। उसके बाद एक पर्दा

हटाया गया तो उसके पीछे बतरीक़ मौजूद था। कुरैशी उसको देखकर हैरान रह गया। इतिहास के अगले अल्फ़ाज़ ये हैं:

> "अमीर मआविया ने कुरैशी को मुखातिब करते हुए कहा कि ऐ मेरे चचा के बेटे, अब तुम इस सूरी व्यापारी का शुक्रिया अदा करो। उसको मैंने जो तदबीर भी बताई उसने उस पर पूरी तरह अमल किया और अब तुम इस बतरीक़ से इस पर जुल्म किए बगैर अपना हक़ ले सकते हो। कुरैशी ने कहा कि अगर मैंने क़सम न खाई होती तो मैं इसको माफ़ कर देता। फिर हाथ उठाया और उसको एक तमांचा मारा और कहा कि बस यह काफी है। बाकी को मैं माफ़ करता हूं। फिर मआविया ने बतरीक़ की तरफ़ देखा और कहा कि अब तुम तीन दिन के लिए हमारे यहां मेहमान हो। तीन दिन गुज़रने के बाद उसको सूरी व्यापारी ने इस हाल में वापस किया कि उसके साथ वे तमाम तोहफ़े थे जिनकी उसने मांग की थी। इसके बाद कुस्तुनतुनिया में तमाम बतरीक़ रोमी बादशाह के पास जमा हुए। उन्होंने कहा कि अब मुस्लिम कैदियों के साथ बुरा सलूक न करो, क्योंकि मैंने इज़्ज़त और शराफ़त और सदाचार में उनके जैसा नहीं देखा। और अगर मआविया मुझको पकड़ना चाहते तो वह इसके लिए असमर्थ न थे; मगर उन्होंने ऐसा करना पसन्द नहीं किया।" (*अल-दावत*, मक्का, 14 जमादी अल ऊला, 1405 हिजरी)

अल्लाह से मांगने की सबसे बड़ी चीज़ मग़फ़िरत है

अन्स बिन मालिक रज़ि अल्लाहु अन्हु कहते हैं: अन्सार के पास सिंचाई के ऊंटों की तंगी हुई। वह रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम के पास आए, ताकि आप उनके लिए ऊंटों का इंतिज़ाम कर दें या खूब बहने वाली नहर ख़ुदवा दें। रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम ने उनको देख कर फ़रमायाः अन्सार के लिए मरहबा! अन्सार के लिए मरहबा! अन्सार के लिए मरहबा! (यानी अन्सार का स्वागत है) आज तुम मुझसे जिस चीज़ का भी

सवाल करोगे मैं तुम्हें ज़रूर दूंगा और तुम्हारे लिए अल्लाह से जो चीज़ भी मांगूंगा वह ज़रूर अता फ़रमाएगा।

रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम की जुबान से यह कलिमात सुन कर अन्सार का दिल फिर गया। उन्होंने सोचा कि मांगने की ज़्यादा बड़ी चीज़ तो आख़िरत है। फिर ऐसे क़ीमती मौक़े पर आपसे दुनिया क्यों मांगे। उन्होंने एक दूसरे से कहाः इस मौके को ग़नीमत जानो और आपसे मफ़िरत (बख़शिश) का सवाल करो।

उन्होंने कहाः ऐ अल्लाह के रसूल, हमारे लिए मग़फ़िरत की दुआ फ़रमाएं। आपने फ़ौरन कहाः ऐ अल्लाह, अन्सार की मग़फ़िरत फ़रमा, उनके लड़कों की मग़फ़िरत फ़रमा, उनकी औरतों की मग़फ़िरत फ़रमा (अहमद)

तरतीब

ऊंची इमारतों में आटोमैटिक लिफ्ट लगी होती है। आप उसके अन्दर दाख़िल होकर बटन दबाते हैं और वह आपको उस मंज़िल तक पहुंचा देती है, जहां आप जाना चाहते हैं।

मान लीजिए कि चार आदमी एक ही वक़्त में लिफ्ट के अन्दर दाख़िल होते हैं। आपको दूसरी मंजिल तक जाना है और बाक़ी लोग दसवीं और ग्यारहवीं मंज़िल पर जाने वाले हैं। अब अगर दूसरे लोग पहले अपने नम्बर वाला बटन दबा दें और आप अपना नम्बर बाद में दबाएं तो ऐसा नहीं होगा कि लिफ्ट पहले ऊपर चली जाए और बाक़ी लोगों को दसवीं और ग्यारहवीं मंज़िल पर उतारे और उसके बाद नीचे आकर आपको दूसरी मंज़िल पर पहुंचाए। बटन दबाने की बेतरतीबी के बावजूद ऐसा होगा कि लिफ्ट पहले दूसरी मंजिल के मुसाफिर को उतारेगी, उसके बाद वह ऊपर की मंज़िलों पर जाएगी।

ऐसा होता है? बटन दबाने की बेतरतीबी को वह अपने आप किस तरह बातरतीब बना लेती है। इसका जवाब कंप्यूटर है। आधुनिक लिफ्टों में कंप्यूटर लगा होता है। यह कंप्यूटर एक तरह के मशीनी दिमाग़ की तरह काम करता है। वह बटन दबाने की बेतरतीबी को मंज़िल की तरतीब में बदल देता है और लिफ्ट को 'आदेश' देता है कि मंज़िल की वास्तविक तरतीब के हिसाब से मुसाफ़िरों को ऊपर ले जाए।

आटोमैटिक लिफ्ट ख़ुदा की एक मामूली रचना है। जब ख़ुदा की एक अदना सी रचना में यह क्षमता है कि वह ग़लत तरतीब (क्रम) को सही तरतीब में बदल दे तो यह क्षमता ख़ुद रचनाकार के अन्दर कितनी ज़्यादा होगी?

मौजूदा दुनिया इम्तिहान की दुनिया है। यहां इन्सान को पूरी आज़ादी दी गई है। इस आज़ादी से फायदा उठा कर लोगों ने अपना नाम ग़लत तरतीब के साथ लिख लिया है। कोई तीसरे दर्जे का आदमी है, पर उसने अपना नाम नम्बर एक पर लिखा रखा है। कोई निचली सतह पर बिठाए जाने के काबिल है, पर उसने अपने आपको ऊंची सतह पर बिठा रखा है। कोई है जो सिरे से जिक्र के काबिल नहीं पर वह कृत्रिम तौर पर शोहरत के स्टेज पर जगह हासिल किए हुए है। आख़िर में तमाम ग़लत तरतीब दुरुस्त कर दी जाएगी। इसके बाद अदना दर्जे का आदमी अदना सीट पर पहुंचा दिया जाएगा। और ऊंचे दर्जे का आदमी ऊंची सीट पर।

जो खोए वही पाता है

हज़रत अबू बक्र ने हज़रत ख़ालिद को एक बार जिहाद पर भेजा। उस वक़्त आपने उनको जो नसीहतें कीं उनमें से एक नसीहत यह थी कि मौत के चाहने वाले बनो, तुम को ज़िन्दगी दी जाएगी।

BOOKS FOR UNDERSTANDING THE SPIRITUAL ESSENCE OF ISLAM

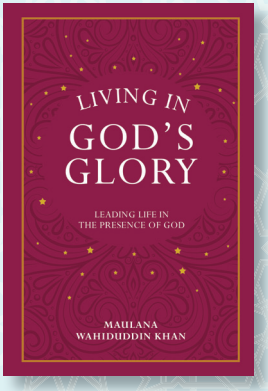

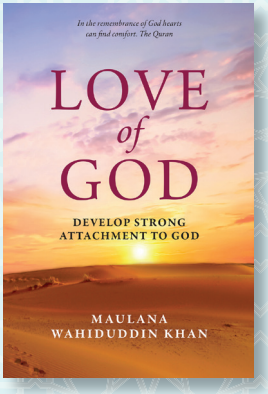

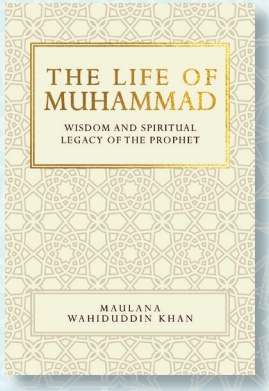

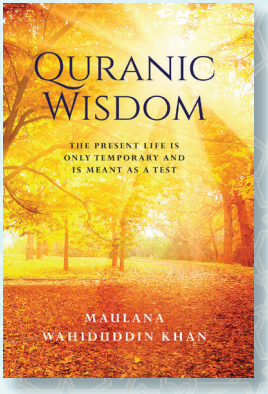

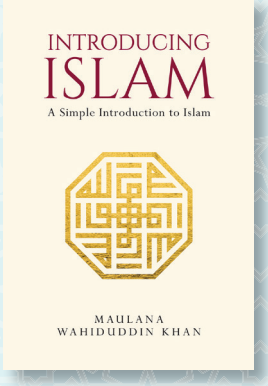

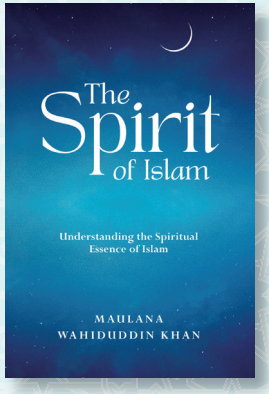

These books provide the general reader with an accurate and comprehensive picture of Islam– the true religion of submission to God.

To order call: 8588822675
sales@goodwordbooks.com

www.goodwordbooks.com

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Posted at NDPSO

Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2021-23
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2021-23